ترتیب مضامین

مضامین	مضمون نگار	صفحہ
اداریہ :تحفظ شریعت سے زیادہ تفہیم شریعت کی ضرورت	منور سلطان ندوی	۳
دنیا کی فریفتگی ساری گمراہیوں کی جڑ ہے	مولانا شہاب الدین ندوی	۵
یونیفارم سول کوڈ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۸
غیر سودی بینکاری کے بنیادی اصول	مفتی محمد تقی عثمانی	۱۹
سافٹ ڈرنک سے ذیابطیس کا خطرہ:	ڈاکٹر اشفاق احمد	۲۲
غیر مسلموں سے تعلقات: اسلامی نقطہ نظر	مولانا نوشاد عالم ندوی	۲۳
اسلام کا نظام طلاق	مولانا منور سلطان ندوی	۳۳
نبوی تعلیم کی خوشبو	اسامہ بن مولانا امتیاز ندوی	۴۳
یہ عبرت کی جا ہے، تماشا نہیں ہے	مولانا محمد فرمان ندوی	۴۴
نماز کے چند اہم مسائل	مولانا اکرام احمد ندوی	۴۷

نوخیز نسل اور بڑی نسل دونوں کی فکر ضرور ہے !

مسئلہ صرف نوخیز نسل کا ہی نہیں بلکہ اب بڑی نسل کا بھی ہے، دونوں طرح کی نسلوں کو مذہب کا وفادار اور مسلمانوں کے تہذیبی ونظریاتی اقدار کا پابند کس طرح رکھا جائے؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے، اگر اس کی فکر نہیں کی جاتی تو مسلمانوں کی تہذیبی ونظریاتی زندگی کا بہ تدریج تحلیل ہوکر دیگر کسی قوم کے مذہبی ،تہذیبی، ونظریاتی سانچوں میں ڈھل جانا مستبعد نہیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء وصدر مسلم پرسنل لا بورڈ)

تحفظ شریعت سے زیادہ تفہیم شریعت کی ضرورت

منور سلطان ندوی

طلاق اور پرسنل لا سے متعلق بعض مسائل پر ذکیہ سونم کی تحریر پر موجودہ حکومت نے جس رویہ کا اظہار کیا وہ مسلمانوں کے لئے بے حد تشویشناک ہے، یہ صاف شریعت میں مداخلت کی کوشش اور یکساں سول کوڈ کے لئے راہ ہموار کرنا ہے، اس لئے اس مسئلہ پر مسلمانوں کا بیدار ہونا اور حکومت کے رویہ کے خلاف احتجاج دراج کرانا مسلمانوں کی ملی ذمہ داری ہے ،اور ملک کا دستور اس بات کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ عائلی مسائل کو مسلمانوں کا حق قرار دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو کچھ ہوا اور جو ہو رہا ہے کیا یہ خلاف توقع کوئی ناگہانی صورت حال ہے؟ کیا پہلی بار اس طرح کے مسئلہ سے مسلمانان ہند دوچار ہوئے ہیں؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا، اور جواب کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ برسر اقتدار پارٹی کا جو پس منظر ہے اس سے اس طرح کی حرکتوں کا سرزد ہونا خلاف توقع عین مطابق توقع ہے، یہ اس کے مشن کا حصہ ہے، سوچی سمجھی پلاننگ ہے، کوئی ناگہانی یا انہونی بات نہیں۔

اور جہاں تک سوال ہے کہ مسلم خواتین کے ہی ایک طبقہ کے ذریعہ یہ تحریک چلائی گئی تو اس بارے میں بھی سب جانتے ہیں کہ یہ صرف مہرے ہیں، ان کی اپنی کوئی بساط نہیں ہے، لیکن افسوس یہاں بھی ہوتا ہے کہ ہمارے مسلم سماج میں ایسے بے شمار افراد موجود ہیں جو کسی بھی کام کے لئے حکومت کے مہرے بہ آسانی بن جاتے ہیں، بلکہ غور کریں تو اس طرح کتنے 'ذی وقار' ہیں جو درپردہ حکومت کے مشن کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔

ان دونوں باتوں کو جوڑنے سے جو تیسری سامنے آتی ہے وہ یہ کہ توقع کے مطابق ہوئے ہنگامے پر ہمارا ردعمل کیا رہا؟ ان حوالہ سے غور کرنے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہمارے دینی وملی قائدین نے بروقت اس مسئلہ پر توجہ کی اور اس کا نوٹس لیا، اس موقع پر مسلک ومشرب سے اوپر اٹھ کر علماء کرام جمع ہوئے، اور مسئلہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بے مثال اتحاد کا مظاہرہ کیا، یہ بات یقیناً قابل ستائش ہے، اور اس سے بہت ذبردست پیغام گیا، مسلمانوں کو بھی اور حکومت کو بھی۔

حکومت نے بہت سوچ سمجھ کر طلاق کو ایشو بنانے کا فیصلہ کیا تھا، اسے توقع تھی کہ اس مسئلہ پر مسلمانوں کے درمیان مسلکی جنگ بھڑک اٹھے گئی، مگر قابل مبارک باد ہیں ملت کے قائدین جنہوں نے اس نکتہ کو بخوبی سمجھا، اور ایسے اتحاد کا مظاہرہ کیا کہ شاہ بانو کیس کا منظر یاد آنے لگا، بلاشبہ یہ بڑی اہم بات ہے، ملک کے کونہ کونہ میں شریعت کے نام پر مسلمانوں نے جس بیداری کا ثبوت دیا اس سے صرف اندازہ ہی نہیں یقین ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی دینی حمیت ابھی بھی زندہ ہے۔

اس مسئلہ پر پورے ملک میں مسلمانوں نے کھل کر احتجاج کیا، بڑے بڑے احتجاجی مظاہرے ہوئے، ریلیاں نکالی گئی، جلسے ہوئے، ان تمام کاروائیوں میں دستخطی مہم سب سے زبردست رہا، اس مہم کو سب سے زیادہ رسپانس ملا، اور یقیناً اس کے اثرات بھی نظر آئیں گے، اس موقع پر مسلمانوں کی سب سے زیادہ توجہ تحفظ شریعت کے عنوان سے جلسے جلوس پر رہی، مسلمانوں کی طرف سے شریعت میں مداخلت کونا کام کرنے کے زبردست نعرے لگے، یہ سب ضروری ہے، لیکن ان سے سب کے ساتھ سب سے زیادہ ضروری کام مسلمانوں کو شریعت سمجھانا، اور انہیں شریعت کا وفادار بنانا ہے، تشویش کی بات یہ ہے کہ نئی نسل کے ساتھ پرانی نسل کا بہت بڑا طبقہ دین اور شرعی احکام پر مطمئن نہیں ہے، شریعت سے محبت انہیں لب کشائی سے مانع ضرور رکھتی ہے، مگر صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ مطمئن نہیں ہیں، اس لئے سب سے زیادہ اس سمت توجہ کرنے کی ہے، شریعت سے متعلق مسلمانوں کے ذہنوں کو مطمئن کیا جائے، اسی کے ساتھ برادران وطن کے ذہنوں میں اس حوالہ سے جو کانٹے ہیں انہیں نکالنے کی کوشش کی جائے۔

اس کام کا یہ بہتر موقع ہے، اس سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے، ہمارا ہدف یہ ہو کہ شریعت کے نظام سے عام مسلمانوں کو واقف کرانا ہے، انہیں اس عادلانہ، ، اور انسانی تقاضوں کی رعایت پر مبنی آسمانی نظام پہ مطمئن کرنا ہے، اور پھر اس نظام کو بطور نظریہ حیات برادران وطن کے سامنے پیش کرنا ہے، یہی مسئلہ کا دائمی حال ہے، اگر شریعت ہمارے عمل کا حصہ بن جائے ،اور ہماری زندگی شریعت کے مطابق ڈھل جائے تو پھر شریعت کا تحفظ خود ہو جائے گا۔

درس قرآن

دنیا کی فریفتگی ساری گمراہیوں کی جڑ ہے

مولانا شہاب الدین ندوی

(استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

یـا أیهـا النـاس اتقوا ربکم و اخشوا یوماًلایجزی و الد عن و لده ولا مـولـود هـو جـاز عن والده شیاً ان وعد الله حق فلا تغرنکم الحیاة الدنیا ولا یغرنکم بالله الغرور (سورہ لقمان:۳۳)

ترجمہ وتشریح: اے لوگو! اپنے پروردگار (کے احکام کی مخالفت) سے ڈرو، (خدا کی عظمت و ہیبت تمہارے قلوب پر ایسی حاوی ہو جائے کہ تم اس کی مکمل اطاعت و فرمانبرداری آسانی سے کرسکو) اور اس دن کا خوف رکھو جب نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو کوئی نفع پہونچاسکے گا اور نہ بیٹا باپ کو نفع پہونچانے والا ہوگا (یعنی ڈرنے کی چیز وہی حشر ہے جہاں کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا، یہاں تک کہ قریب ترین، عزیز ترین رشتہ دار بھی، اور یہ دن ضرور آنے والا ہے، کیونکہ اس کی نسبت اللہ کا وعدہ ہے) اور یقیناً اللہ کا وعدہ سچا (ہوتا) ہے، سو دنیوی زندگی تمہیں کہیں دھوکے میں نہ ڈال دے (کہ اس میں منہمک ہوکر اس دن سے غافل ہو جاؤ) اور نہ کہیں وہ بڑا فریبیا (یعنی شیطان) تمہیں اللہ کے باب میں دھوکے میں رکھے (کہ تم اس کے بہکاوے میں آجاؤ کہ اللہ تم کو عذاب نہ دیگا جیسا کہا کرتے تھے کہ ولئن رجعت الی ربی ان لی عنده للحسنی)

سورہ لقمان کی مذکورہ آیت میں مومن و کافر سبھی کو ایک عام صیغہ خطاب کے ذریعہ خدا تعالیٰ اور قیامت کے حساب و کتاب سے ڈرا کر اس کیلئے فکرمندی اور تیاری کی ہدایت کی گئی ہے، کہ روز محشر انتہائی دلدوز و جان گسل ہے، اس دن سخت نفسی نفسی کا عالم

ہوگا، کوئی کسی کے کام نہ آویگا، اپنے بھی پرائے ہو جائیں گے، وہاں صرف ایمان و اعمال کا سکہ چلے گا، ایسے سخت ترین دن کے آنے سے پہلے ہی اس کی تیاری کر لینا ہی عقلمندی و ہوشیاری ہے۔

"أیهـا النـاس" کے عام صیغے سے تمام انسانوں کو مخاطب بنا کر کہا جارہا ہے کہ اے لوگو! اپنے پروردگار و پالن ہار سے ڈرو، جو اس کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے ہو، جیسے بیٹا اپنے باپ سے اور شاگرد اپنے استاذ سے ڈرتا ہے، اور یہی ڈر اس کو باپ اور استاذ کی اطاعت پر مجبور کرتا ہے، یہاں پر بھی وہی خوف مراد ہے جو انہیں مکمل اطاعت کرنے اور اس کے احکام کی مخالفت سے بچنے پر آمادہ کرے۔

اگلے ٹکڑے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ روز محشر سے ڈرو جس میں مطلقاً کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا، یہاں تک کہ انتہائی قریب ترین اور عزیز ترین رشتہ دار بھی ایک دوسرے کو فائدہ نہیں پہونچاسکیں گے۔

دوسری آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کی صراحتوں کی بنیاد پر یہاں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ یہ اصول وضابطہ بالکل عام نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ باپ و بیٹے ہیں جن میں ایک مومن اور دوسرا کافر ہو کیونکہ مومن باپ اپنے کافر بیٹے کو نہ کوئی نفع پہونچا سکے گا اور نہ اس کے عذاب میں کوئی کمی کرا سکے گا، اسی طرح مومن بیٹا اپنے کافر باپ کے کچھ کام نہ آسکے گا، قرآن کریم کی آیت "و الذین آمنوا و اتبعتهم ذریتهم بایمان ألحقنا بهـم ذریتهـم" اور دوسری آیت "جـنـات عـدن یـدخلونها و من صلح من آبائهم و أزواجهم و ذریاتهم" ان دونوں آیتوں کے بارے میں صاحب تفسیر مظہری لکھتے ہیں کہ ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوا کہ ماں باپ اور اولاد اسی طرح شوہر بیوی اگر مومن ہونے میں مشترک ہوں تو پھر ایک سے دوسرے کو محشر میں فائدہ پہونچے گا، اسی طرح متعدد روایات حدیث میں اولاد کا ماں باپ کی شفاعت کرنا منقول ہے، اس لئے آیت مذکورہ کا یہ ضابطہ کہ کوئی باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو محشر میں کوئی فائدہ نہ پہونچا سکے

گا، یہ اسی صورت میں ہے کہ ان میں سے ایک مومن ہو دوسرا کافر۔

قرآن کریم ادب عالی اور معجزانہ بلاغت کا ایسا اچھوتا اور بے مثال نمونہ ہے کہ جس قدر اس میں غور کیا جاتا ہے اتنا ہی ادب وبلاغت اور حکمت کے آبدار موتیوں کا انکشاف ہوتا ہے،"لایجزی و الد عن ولده" اور لامولود هو جاز عن والده شیئاً" ان دونوں جملوں میں فعلیہ اور اسمیہ کا فرق، اور دوسرے جملے میں ولد کے بجائے مولود کا لفظ اختیار کرنا اپنے اندر انتہائی بلیغانہ حکمتوں کا حامل ہے، جو کلام خداوندی ہی کا حصہ ہے۔

'فلا تغرنکم الحیاة الدنیا و لا یغرنکم بالله الغرور' سو تمہیں دنیاوی زندگی دھوکہ میں نہ ڈال دے، یعنی تم اس دنیا کی چمک دمک پر فریفتہ ہو جاؤ، اس کی ظاہری خوشنمائی و رعنائی میں پھنس کر آخرت کو بھلا بیٹھو اور اس ابدی ٹھکانے اور اٹل حقیقت کی یاد سے غافل ہو جاؤ۔

بلاشبہ یہ دنیا اور اس کی ظاہری آب وتاب اور اس کی رونق ودلفریبی اور اس کے ساز وسامان کی چمک دمک بڑے ہی ڈرنے کی چیز ہے، غور کیا جائے تو ساری گمراہیوں کی جڑ، سارے فتنوں کا منبع اور تمام تباہ کاریوں کا سرچشمہ یہی دنیا کی محبت وفریفتگی نکلے گی، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا بلیغانہ فرمان ہے"حب الدنیا رأس کل خطیئة"اس سے بڑھ کر کوئی ہوشیار اور دانا نہیں جو اس دنیا کی حقیقت سے آگاہ اور اس کی اصلیت سے باخبر ہو جائے۔

'ولا یغرنکم بالله الغرور' غرور یوں تو ہر وہ چیز ہے جو انسان کو غفلت اور دھوکے میں ڈال دے، مال ہو، جاہ ہو، خواہش نفسانی ہو یا خود شیطان ہو، لیکن صحابہ و تابعین کی روایت کے مطابق یہاں پر مراد شیطان ہے، اس بڑے دھوکہ باز اور فریبیے کا حق تعالیٰ کے باب میں دھوکہ یہی ہے کہ عذاب وعقاب کی خبریں سب غلط وبے بنیاد ہیں، نہ کوئی عالم آخرت ہے اور نہ وہاں حساب وکتاب اور پکڑ دھکڑ۔

(باقی آئندہ)

یونیفارم سِول کوڈ

شریعت، دستور اور قومی مصالح کی روشنی میں!

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا)

ہندوستان میں جس وقت انگریزوں کے خلاف جدوجہد جاری تھی اور ہندوستان کے تمام شہری اس بدیشی دشمن کے خلاف سیسہ کی دیوار بنے ہوئے تھے، اس وقت فکر ونظر، تہذیب، قومی مفادات، زبان، نسل اور جغرافیائی تعلق میں تفاوت کے باوجود جو چیز ان سب کو سیسہ پگھلائی ہوئی دیوار بنائے ہوئی تھی، وہ یہی تصور تھا کہ آزادی کے بعد یہ ملک سیکولرزم کی راہ پر چلے گا، ہر مذہب، ہر تہذیب اور ہر جماعت سے تعلق رکھنے والوں کو اپنی انفرادی زندگی میں آزادی حاصل ہوگی، مسلمان جو مذہبی اعتبار سے زیادہ باحمیت واقع ہوئے ہیں، ممکن نہ تھا کہ وہ اس تیقن کے بغیر اس لڑائی میں شریک ہوتے، آزادی سے پہلے ہمیشہ 'قومی لیڈران' مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور اس میں عدم مداخلت کا یقین دلاتے رہے، مہاتما گاندھی جی نے خود بھی گول میز کانفرنس لندن ۱۹۳۱ء میں پوری وضاحت و صراحت کے ساتھ کہا تھا: "مسلم پرسنل لا کو کسی بھی قانون کے ذریعہ چھیڑا نہیں جائے گا"

جنگ آزادی کے سالار مولانا ابوالکلام آزادؒ نے فرمایا:

> نہ تو کانگریس ہی کا یہ مقصد ہے اور نہ مسلمان ہی اس مقصد سے قیامت تک متفق ہو سکتے ہیں کہ ہندوستان سے مسلم کلچر، مسلم تہذیب اور مسلم خصائص ختم ہو جائیں اور وہ ہندستان کی متحدہ قومیت میں جذب ہو کر جرمن یا انگریز قوم کی طرح ہندوستانی قوم کے سوا کچھ نہ رہیں۔

۱۹۳۸ء میں ہری پور میں کانگریس نے اعلان کیا: "اکثریت کی طرف سے مسلم

پرسنل لا میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائے گی‘، پھر ۱۹۳۷ء میں ’’شریعت اپلی کیشن ایکٹ‘‘ پاس ہوا، جس نے زیادہ صراحت کے ساتھ مسلم پرسنل لا کو آئین کا حصہ بنا دیا۔

پھر آزادی حاصل ہونے کے بعد جب ہندوستان کا دستور بنا، تو قانون کے سب سے اہم حصہ ’بنیادی حقوق‘ کی فہرست میں ایسی دفعات بھی رکھی گئیں، جن سے ’’مسلم پرسنل لا‘‘ کی حفاظت ہوتی ہے، دستور ہند کی آرٹیکل ۲۵ میں مذہبی قوانین کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے؛ چنانچہ دفعہ ۲۵ کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

۲۵(۱): پبلک آرڈر، اخلاقیات، صحت عامہ نیز باب:۳ میں دی ہوئی دیگر دفعات کے تابع ہر شہری کو مذہبی عقائد پر قائم رہنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کی اجازت ہوگی۔

دفعہ ۲۵ میں دی گئی مذہبی اُمور کی اس ضمانت سے مذہبی رسوم اور ہندوؤں میں اچھوتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کو مستثنیٰ کرنے کی غرض سے دو اور تشریحی دفعات بڑھا دی گئیں، جو حسب ذیل ہیں :

۲۵(۲)(الف) کسی اقتصادی، مالی، سیاسی یا دیگر سیکولر مسئلہ میں جس کا تعلق مذہبی رسم سے ہو، پابندی عائد کرنا یا اسے ریگولیٹ کرنا۔

۲۵(۲)(ب) سوشیل ریفارم کی خاطر پبلک ہندو اداروں کے دروازے تمام ہندوؤں کے لئے کھولنے کے سلسلہ میں اقدام کرنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ’مذہبی اُمور‘ میں حکومت بالکل دخل انداز نہ ہوگی، ہاں اس سے صرف یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ کوئی چیز اصلاً مذہبی ہونے کے بجائے کسی مذہب سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان ایک رسم کے طور پر مروج ہو، مثلاً: جہیز، تلک وغیرہ، اس میں حکومت مداخلت کرکے ظلم کی روک تھام کر سکے گی، دوسرے: ’’اچھوتوں‘‘ کے سلسلے میں جو امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے، اس کا سدباب کرے گی اور وہ مذہبی حق متصور نہ ہوگا۔

پھر ان ’’بنیادی حقوق‘‘ کو ناقابل تنسیخ بنانے کے لئے دستور کی آرٹیکل ۱۳(۲)

میں یہ بات صاف کردی گئی کہ حکومت کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتی، جو باب:۳ میں دیئے ہوئے بنیادی حقوق کے خلاف ہو، یا اس میں کمی کرے---اس طرح مسلم پرسنل لا کا تحفظ (جس کا تعلق مسلمانوں کے رسوم و رواج سے نہیں ہے؛ بلکہ ان کے اعتقادات اور اسلامی تعلیمات کی بنیادوں---قرآن وحدیث---سے ہے) نہ صرف مسلمانوں کا بنیادی حق قرار پایا؛ بلکہ ناقابل تنسیخ ٹھہرا۔

اس بنیادی حق کے ساتھ ملک کے لئے جو رہنما اُصول وضع کئے گئے، اس کی دفعہ (۴۴) یوں رکھی گئی: ’’(۴۴) ریاست کوشش کرے گی کہ پورے ملک میں شہریوں کے لئے یکساں شہری قانون ہو‘‘ ظاہر ہے یہ دفعہ، دفعہ (۲۵) سے متصادم ہے، دفعہ ۲۵ کا تقاضا ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والوں کے لئے ان کے مذہب کے مطابق قوانین ہوں، جب کہ یہ دفعہ سب کے لئے یکساں قانون وضع کرنے کی متقاضی ہے اور اس کا صاف مطلب ہے کہ حکومت کبھی بھی مسلم پرسنل لا یا کسی دوسرے ’’مذہبی پرسنل لا‘‘ پر دست درازی کر سکتی ہے۔

چنانچہ اس دفعہ پر مختلف مسلم ممبرانِ پارلیمنٹ جناب محمد اسماعیل صاحب، جناب بی، پوکر صاحب، جناب نظیر الدین الدین احمد صاحب اور جناب محبوب علی بیگ صاحب نے تنقید کی اور اس سے مسلم پرسنل لا کو مستثنیٰ رکھنے کا مطالبہ کیا، جناب نظیر الدین صاحب نے کہا :

انگریز ۱۷۵ برس میں جو نہ کر سکے، یا جس کے کرنے سے گھبراتے رہے، اسی طرح مسلمانوں نے ۵۰۰ سالہ دورِ حکومت میں جو کچھ کرنے کی ہمت نہیں کی، ہمیں ریاستوں کو اتنا اختیار نہ دینا چاہئے کہ وہ سب کچھ بیک وقت کر گزریں۔

مگر ڈاکٹر امبیڈکر (چیرمین دستور ساز اسمبلی) نے ایک نہ سنی؛ البتہ مسلمانوں کو تسلی دینے کے لئے کہا :

کوئی حکومت اپنے اختیارات کو اس طرح استعمال کرکے مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ نہیں کر سکتی، میرے خیال میں اگر کسی نے ایسا کیا تو ایسی حکومت پاگل ہی

ہوگی، مگر یہ معاملہ اختیارات کے استعمال کا ہے نہ کہ بذاتِ خود اختیارات کا۔
رہنما اُصول کی یہی دفعہ ہے جس کے بطن سے ”یکساں سول کوڈ“ کا فتنہ پھوٹا ہے اور جس کی صدائے بازگشت سننے میں آتی رہتی ہے۔

دستور کی ان دونوں دفعات میں تعارض اس لئے پیدا ہورہا ہے کہ دفعہ (۴۴) کا تعلق مذہبی قوانین سے جوڑا جارہا ہے؛ حالاں کہ اس کا تعلق دراصل دفعہ (۲۵) کی اس استثنائی دفعہ سے تھا، جس میں کہا گیا ہے کہ ’مذہبی رسوم‘ جن کی مذہب میں کوئی اصل نہ ہو، حکومت کی مداخلت سے ماورا نہیں ہوں گے، گویا غیر مذہبی اُمور میں ریاستوں کو دفعہ ۴۴ کے ذریعہ ”یکساں قانون سازی“ کا اختیار دیا گیا تھا۔

چنانچہ ممبئی ہائی کورٹ کے بینچ نے --- جو جناب عبدالکریم چھاگلا اور جناب گجندر گدکر پر مشتمل تھا --- مقدمہ بنام تارا سوامالی میں دفعہ (۴۴) کے حدود پر مفصل رولنگ دی تھی، اس کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے :

مذہبی رسوم، پبلک آرڈر، اخلاقیات، صحت عامہ، نیز سماجی بہبود کے خلاف ہو تو ایسے رسوم کو مفاد عامہ کے پیش نظر پس پشت ڈالا جاسکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مفاد عامہ (جس میں یکساں سول کوڈ کو داخل کیا جارہا ہے) کو جس چیز پر ترجیح حاصل ہے، وہ مذہبی رسوم ہیں، نہ کہ مذہبی اعتقاد اور مذہبی اعتقاد کے سرچشمہ سے پھوٹنے والے قوانین۔

اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ”رہنما اُصول“ کی دفعہ (۴۴) کا تعلق مذہبی قوانین سے بھی ہے اور اس کے ذریعہ ریاستوں کو مذہبی معاملات میں بھی یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا اختیار دیا گیا ہے تو بھی ”مسلم پرسنل لا“ کا قانونی موقف کافی مضبوط رہتا ہے، اس لئے کہ بنیادی حقوق کی حیثیت دستور کی روح اور بنیاد کی ہے، جب کہ ”رہنما اُصول“ کی حیثیت محض ایک اخلاقی ہدایت کی ہے، بنیادی حقوق کی اس اولیت اور اہمیت کو اکثر ماہرین قانون کے علاوہ ملک کے قائدین نے بھی تسلیم کیا ہے؛ چنانچہ آنجہانی جناب جواہر لال

نہرو، سابق وزیر اعظم ہند نے ”بنیادی حقوق“ کی رپورٹ پر بیان دیتے ہوئے کہا :

بنیادی حق کو کسی وقتی دشواری کے تحت نہ دیکھنا چاہئے؛ بلکہ اس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے کہ آپ اسے دستور میں مستقل مقام دے رہے ہیں، بنیادی حقوق کے علاوہ دوسرے اُمور کو خواہ وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں، اس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے کہ وہ عارضی ہیں۔

اس لئے اگر ان دونوں دفعات کے درمیان تعارض تسلیم کرلیا جائے تو بھی مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا تعلق چوں کہ ”بنیادی حقوق“ سے ہے، اس لئے وہ مقدم ہے اور قابل ترجیح ہے۔

اب اس پس منظر میں لاء کمیشن کے اس سوال نامہ پر غور کیجئے جس کا مقصد یکساں سول کوڈ کے لئے راستہ نکالنا ہے، اس سوال نامہ کا مضمون خود کمیشن کی بددیانتی کا مظہر اور وہ کہتا ہے کہ یکساں سول کوڈ کے حق میں جواب دیا جائے، اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ حکومت کے اشارہ پر ہورہا ہے، حکومت کے اقلیت دشمن جذبات کا اظہار تو خود اس بیان سے ہوگیا جو اس نے طلاقِ ثلاثہ اور تعدد ازدواج کے سلسلہ میں پچھلے دنوں سپریم کورٹ میں داخل کیا ہے، جو حکومت اکثریت کے مذہبی تصورات کو اس قدر فروغ دے رہی ہے کہ لوگوں کو گائے کا پیشاب پلانے اور گوبر کھلانے کے لئے بھی بالواسطہ طور پر تیار ہے اور اس پر پوری دنیا وطن عزیز کا مذاق اڑا رہی ہے، لیکن مسلمانوں کے مذہبی تشخصات ان کے آنکھوں میں چبھ رہی ہیں۔

ہمارے ملک کی معزز عدالتوں کا بھی یہ حال ہے کہ وہ اپنے افکار، اپنے جذبات اور سماجی زندگی سے متعلق اپنے تصورات کو قانون پر فوقیت دینے لگی ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ عدالتیں کبھی از خود طلاق اور تعدد ازواج کے مسئلہ کو اُٹھاتی ہے، کبھی نفقۂ مطلقہ کے مسئلہ کو اور بار بار حکومت کو یکساں سول کوڈ کے سلسلہ میں یاد دلاتی ہیں، کبھی عدالت کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ مسلم خواتین کی بے آبروئی کے قضیہ کو اُٹھائے اور حکومت کو اس کی ذمہ داری یاد دلائے، مطلقہ سے زیادہ دشوار صورت حال بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی ہوتی

ہے، عدلیہ کو خیال نہیں ہوا کہ وہ فسادات میں بیوہ اور یتیم ہو جانے والے سینکڑوں ؛ بلکہ ہزاروں عورتوں اور بچوں کے سلسلہ میں حکومت کو ان کی ذمہ داری یاد دلائے اور مجرموں کے خلاف قدم اُٹھائے ، مسلم عورت کی پسماندگی کا اصل سبب طلاق نہیں ہے ؛ بلکہ مسلمانوں کی بے روزگاری ہے، عدلیہ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اس مظلوم طبقہ کو روزگار کے مواقع دیئے جائیں، عورتوں کے لئے سب سے تکلیف دہ صورت حال ان کے شوہروں اور گھر کے مردوں کی نشہ خوری سے پیدا ہوتی ہے اور رہنما اُصول میں یہ بات بھی موجود ہے کہ ملک میں مکمل نشہ بندی ہونی چاہئے ؛ لیکن اس کے بارے میں نہ حکومت سوچتی ہے ، نہ عدلیہ ہدایت دیتی ہے، نہ دانشوروں میں کوئی فکر پیدا ہوتی ہے ؛ حالاں کہ طلاق کے واقعات کا پیش آنا بہت ہی بُری بات ہے ؛ لیکن مسلم معاشرہ میں اس کا تناسب ہندوؤں سے کم ہے اور بہت سی طلاقیں بیوی کے مطالبہ یا اس کی رضامندی سے ہوتی ہیں اور زیادہ تر حالات میں عورت طلاق کے بعد بے سہارا نہیں ہوتی ، اس کے والد، بیٹے ، بیٹیاں اور بھائی، بہن اس کی کفالت کرتے ہیں ؛ لیکن عدالت کی ساری توجہ اسی ایک مسئلہ پر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ’یونیفارم سول کوڈ‘ مختلف وجوہ سے ہمارے ملک کے لئے مناسب نہیں ہے، ایک تو اس سے اقلیتوں کے مذہبی حقوق متاثر ہوں گے، جو دستور کی بنیادی روح کے خلاف ہے، دوسرے : یکساں قانون ایسے ملک کے لئے تو مناسب ہو سکتا ہے، جس میں ایک ہی مذہب کے ماننے والے اور ایک ہی تہذیب سے تعلق رکھنے والے لوگ بستے ہوں ، ہندوستان ایک تکثیری سماج کا حامل ملک ہے، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں، کثرت میں وحدت ہی اس کا اصل حسن اور اس کی پہچان ہے، ایسے ملک کے لئے یکساں عائلی قوانین قابل عمل نہیں ہیں، تیسرے : مذہب سے انسان کی وابستگی بہت گہری ہوتی ہے ، کوئی بھی سچا مذہبی شخص اپنا نقصان تو برداشت کر سکتا ہے ؛ لیکن مذہب پر آنچ کو برداشت نہیں کر سکتا ؛ اس لئے اگر کسی طبقہ کے مذہبی قوانین پر خط نسخ پھیرنے اور اس پر

خود ساختہ قانون مسلط کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے مایوسی کے احساسات اور بغاوت کے جذبات پیدا ہوں گے اور یہ ملک کی سالمیت کے لئے نقصان دہ ہے، ہمارے سامنے ناگاؤں اور میزوؤں کی واضح مثال موجود ہے کہ انھوں نے اس کے بغیر عَلَم بغاوت کو نہیں جھکایا کہ ان کو کچھ خصوصی رعایتیں دی جائیں، جن میں ان کے لئے اپنے قبائلی قانون پر عمل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے ؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ مختلف گروہوں کو اپنے اپنے قوانین پر عمل کی اجازت دینا ملک کے مفاد میں ہے، اس سے قومی یکجہتی پروان چڑھے گی، نہ یہ کہ اس کو نقصان پہنچے گا۔

مسلمانوں کو تو یونیفارم سول کوڈ پر اعتراض ہے ہی ؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو عملی طور پر خود اکثریتی فرقہ بھی اس کو قبول نہیں کرے گا ، ہندوؤں کی مختلف ذاتیں ہیں اور نکاح وغیرہ کے سلسلہ میں ان کے الگ الگ طریقے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ملک کے سارے ہندوؤں کا ایک ہی طریقہ ہو، حد تو یہ ہے کہ وہ اپنے بنیادی عقائد اور عبادات کی باتوں میں بھی یکساں نہیں ہیں، کوئی مورتی پوجا کا قائل نہیں ہے، کوئی قائل ہے، کوئی راون کو بُرا بھلا کہتا اور رام کو پوجتا ہے، کوئی رام کو بُرا بھلا کہتا ہے اور راون کی پرستش کرتا ہے، خود نکاح کے سلسلہ میں دیکھیں کہ شمالی ہند میں ماموں اور بھانجی کے درمیان نکاح کا تصور نہیں ؛ لیکن جنوبی ہند میں بہن کا اپنے بھائی پر حق سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کی بیٹی سے نکاح کر لے، قبائلیوں کے یہاں خاندانی رسم و رواج بالکل مختلف ہیں، آج بھی بعض قبائل میں ایک مرد ایک درجن سے زائد عورت سے نکاح کر سکتا ہے، یہاں تک کہ ابھی بھی ایسی رسمیں پائی جاتی ہیں کہ ایک عورت ایک سے زیادہ مرد کے نکاح میں ہوتی ہے، جس ملک میں مذاہب اور تہذیبوں کا اس قدر تنوع پایا جاتا ہو، وہاں ایک ہی قانون تمام گروہوں کے لئے کیسے مناسب ہو سکتا ہے؟

جو لوگ یکساں سول کوڈ کے وکیل ہیں، وہ بنیادی طور پر دو باتیں کہتے ہیں: ایک یہ کہ اس سے قومی یکجہتی پیدا ہوگی ، دوسرے: جب یورپ میں تمام قوموں کے لئے یکساں قانون ہو سکتا ہے تو ہندوستان میں کیوں نہیں ہو سکتا ؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ دونوں ہی

باتیں غلط ہیں، قانون سے قومی یکجہتی پیدا نہیں ہوتی، قومی یکجہتی، رواداری، تحمل اور ایک دوسرے کے معاملہ میں عدم مداخلت سے پیدا ہوتی ہے، دنیا کی دونوں جنگ عظیم بنیادی طور پر ایسی دو قوموں کے درمیان ہوئی ہے، جن کا مذہب ایک تھا، جن کی تہذیب ایک تھی، جن کا قانون اور طرز زندگی ایک تھا، یہ ساری وحدتیں جنگ کو روکنے اور قومی وحدت پیدا کرنے میں ناکام رہیں، خود مسلم ممالک میں دیکھئے کہ عراق وایران، شام وافغانستان کے مختلف گروہوں کے درمیان اس کے باوجود جنگیں ہو رہی ہیں کہ وہ بنیادی طور پر ایک ہی مذہب اور ایک ہی قانون کی حامل ہیں، ہندوستان ہی کو دیکھئے کہ یہاں مختلف راجاؤں کے درمیان جنگوں کی ایک طویل تاریخ ہے، یہ سب ایک ہی طریقہ زندگی پر چلنے والے لوگ تھے؛ لیکن یہ وحدت ان کو جوڑ نہیں پائی اور آج بھی فرقہ وارانہ فسادات اس لئے نہیں ہوتے کہ مسلمانوں کا معاشرتی قانون الگ ہے اور ہندوؤں کے خاندانی رسوم ورواجات الگ ہیں؛ بلکہ اس کے برعکس مذہبی قانون سے ہٹ کر جب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دام محبت میں گرفتار ہو کر بین مذہبی شادی رچاتے ہیں تو اس سے فرقہ وارانہ تناؤ پیدا ہوتا ہے اور قومی یکجہتی پارہ پارہ ہو جاتی ہے؛ اس لئے یہ سوچنا قطعاً غلط ہے کہ قانون کی وحدت کی وجہ سے قومی یکجہتی پیدا ہوگی، ویسے بھی عائلی زندگی کے علاوہ تمام قوانین میں پہلے سے یکسانیت موجود ہے؛ لیکن کیا یہ یکسانیت قومی اتحاد کو برقرار رکھنے میں کافی ثابت ہو رہی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ قومی یکجہتی اس بات سے پیدا ہوگی کہ ہر گروہ کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اپنی تہذیب کو پروان چڑھانے کا موقع دیا جائے، اس سے ہر گروہ میں اطمینان ہوگا، وہ محسوس کریں گے کہ وہ اس ملک میں برابر کے شہری ہیں، اس سے حب الوطنی میں اضافہ ہوگا، احساس محرومی ختم ہوگا، بھائی چارہ کا ماحول پیدا ہوگا اور یہی قومی یکجہتی ہے، ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہر چیز میں یکسانیت اور وحدت پیدا کرنا ممکن نہیں ہے، اگر آپ قانون ایک کر بھی دیں تو ملک میں جو مختلف تہذیبی اور ثقافتی گروہ ہیں، جن کے لباس و پوشاک، رہن سہن، خوشی وغم کے اظہار کے طریقے، زندگی گزارنے کے انداز، سماجی رسوم

ورواجات الگ الگ ہیں اور اس کی جڑیں ان کے مذہب، موسم، جغرافیائی محل وقوع، خاندانی روایات اور نسلی خصوصیات میں پیوست ہیں، کیا ان کو بھی ختم کیا جا سکتا ہے؟ پھر یہ بات قابل غور ہے کہ مذہب، تہذیب اور زبان کا یہ تنوع کوئی عیب ہے یا یہ اس ملک کا حسن ہے؟ گلاب کا ایک پھول بھلا لگتا ہے یا مختلف پھولوں کا گلدستہ؟ پھول کا ایک پودا خوبصورت نظر آتا ہے، یا طرح طرح کے پودوں پر مشتمل پھلواری؟ ظاہر ہے کہ جو خوبصورتی اس تنوع میں ہے، وہ خوبصورتی اس وحدت میں پیدا نہیں ہو سکتی، جس کے پیچھے جبر اور دباؤ کا دخل ہو، ہندوستان کو اس کے معماروں نے گلدستہ بنایا ہے نہ کہ ایک پھول، اس ملک کے سینچنے والوں نے اس کو نوع بہ نوع درختوں کا ایک باغ سدا بہار بنایا ہے نہ کہ صرف ایک ہی طرح کے درختوں کا باغیچہ، اس کے بنانے والوں کے ذہن میں تھا کہ یہ ملک ایک چراغ ہمہ رنگ ہو، یہی ہمہ رنگی اس کا حسن اور یہی تنوع اس کی پہچان ہے۔

یورپ کی جو مثال ہندوستان کے لئے پیش کی جاتی ہے، وہ بالکل بے محل ہے، ہندوستان اتنا وسیع ملک ہے کہ پورا یورپ اس کے ایک حصہ میں سما جائے، اور ہندوستان کی آبادی اتنی کثیر ہے کہ شاید پورا یورپ مل کر بھی اس کی ہمسری نہ کر سکے؛ اگر اس معاملہ میں ہم کو دوسرے ملک کو مثال بنانا ہی ہے تو امریکہ کو بنانا چاہئے، جو دنیا کی دوسری سب سے بڑی جمہوریت ہے اور ہندوستان ہی کی طرح ایک ملٹی کلچر معاشرہ ہے، یہاں پر ریاست میں الگ الگ پرسنل لاء نافذ ہے، یہاں تک اگر ایک ایسی ریاست کا شہری دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہے جہاں دوسری شادی کی اجازت نہیں تو وہ دوسری ایسی ریاست میں جا کر دوسری شادی کرتا ہے جہاں اس کی ممانعت نہیں ہے۔

اس لئے ہندوستان جیسے ملک کی سالمیت اور قومی یکجہتی اسی بات میں مضمر ہے کہ اس میں تنوع کو برقرار رکھا جائے اور ایسی وحدت پر زور نہ دیا جائے، جو اتحاد کو پارہ پارہ کر کے رکھ دے--- مشرقی ملکوں اور مغربی ملکوں میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ مغرب میں لوگوں کا مذہب سے سنجیدہ اور جذباتی تعلق نہیں ہے؛ ان کے یہاں ایک دو تیوہاروں کے

سوا مذہب سے زندگی کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا، مردم شماری کے ریکارڈ میں صرف خاندانی روایت کے طور پر کسی مذہب کا نام لکھا دیا جاتا ہے؛ اس لئے مذہبی قوانین کے ختم کئے جانے پر ان کا کوئی ردعمل نہیں ہوتا اور یہ دراصل چرچوں کے ظالمانہ رویہ کے خلاف عوام کی بغاوت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے قید آزادی کا نتیجہ ہے، جس کی ایک کڑوی تاریخ ہے، ہندوستان کی یہ صورت حال نہیں ہے، ہندوستان میں بسنے والے لوگ مذہب سے جذباتی تعلق رکھتے ہیں؛ اسی لئے جب ۱۹۵۶ء میں ہندوؤں کے لئے باضابطہ قانون بنا تو خود صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اس سے دل برداشتہ تھے، اور اسی لئے ہندوؤں سے متعلق قوانین میں ہر جگہ اس بات کو شامل کرنا پڑا کہ اگر کہیں مقامی رسم ورواج اس کے خلاف ہو تو اس کو ترجیح ہوگی۔

یکساں سول کوڈ کے حق میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اور سیکولر ملک میں مذہبی قوانین کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے--- یہ بھی محض غلط فہمی ہے، سیکولرازم کا کوئی ایک مفہوم متعین نہیں ہے؛ بلکہ مختلف ملکوں میں وہاں کے حالات اور مصالح کے لحاظ سے اس کا مفہوم متعین کیا گیا ہے، سیکولرازم کا ایک مفہوم وہ ہے، جو فرانس نے اختیار کیا ہے، جس کی بنیاد مذہب کی مخالفت پر ہے، جو چاہتا ہے کہ کوئی مذہبی شناخت باقی نہ رہے تو بہتر ہے، جو اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ انسان اپنی زندگی کے کسی بھی شعبہ میں مذہبی ہدایات پر عمل کرے، سیکولرازم کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ حکومت کا کوئی مذہب نہ ہو، سرکاری طور پر کسی خاص مذہب کی پشت پناہی نہ ہو؛ لیکن ملک کے ہر شہری کو اپنی نجی زندگی میں مذہب پر عمل کرنے کی گنجائش ہو، بیشتر مغربی ممالک میں اسی مفہوم کے اعتبار سے سیکولرازم کو اختیار کیا گیا ہے اور ہندوستان میں بھی اسی کو برتا گیا ہے، نیز اسی کے مطابق دستور کی تدوین عمل میں آئی ہے؛ اس لئے یہ بات بالکل بے محل ہے کہ چوں کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے؛ اس لئے یہاں عائلی زندگی سے متعلق مذہبی قوانین کی گنجائش نہیں۔

یہ بات بھی بہت عجیب لگتی ہے کہ بی، جے، پی نے یونیفارم سول کوڈ کو اپنے

ایجنڈے میں رکھا ہے، یہ فرقہ پرست پارٹی بنیادی طور پر برہمنی فکر کی نمائندہ ہے اور آر، ایس، ایس، کا سیاسی بازو ہے، جو ہندوستان میں 'منوواد' کو واپس لانا چاہتی ہے، یہ اپنے آپ کو ہندوؤں کے حقوق کا محافظ قرار دیتی ہے، اگر اس نے ایسے مسائل کو اپنی فہرست میں رکھا ہے، جن میں ہندوؤں اور دوسری اقلیتوں کے مفادات میں ٹکراؤ ہو، یا جن کا مقصد ہندوؤں کی بالادستی قائم رکھنا ہو تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے؛ لیکن مسلم پرسنل لا کا مسئلہ مسلمانوں کا آپسی مسئلہ ہے، اگر اس پر مسلمان عمل کریں تو اس سے ہندوؤں کو نہ فائدہ ہے نہ نقصان؛ بلکہ ایک طرح سے فائدہ ہے کہ مسلم پرسنل لا کے تحت مسلمان اور ہندو کے درمیان رشتہ نکاح قائم نہیں ہوسکتا، اس طرح وہ بات پیش نہیں آئے گی، جس سے یہ حضرات خوفزدہ ہیں اور جس کو غلط طریقہ سے انھوں نے ''لَو جہاد'' کا نام دے رکھا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں سے نفرت اور اقلیتوں کے ساتھ ظلم وناانصافی کے سوا اس کا کوئی اور محرک نہیں ہوسکتا۔

اور صرف بی، جے، پی کا رونا کیوں کر رویا جائے؟ افسوس تو انگلی پر گنے جانے والے ان چند نام نہاد مسلمانوں پر ہے، جو فرقہ پرست اور اسلام دشمن عناصر کا آلۂ کار بن کر مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں، میں ان کی مجبوری سے اچھی طرح واقف ہوں، وہ دراصل اپنی بے روزگاری کا حل نکالنا چاہتے ہیں؛ کیوں کہ جو لوگ صلاحیت کی بنا پر نہیں؛ بلکہ خوشامد کی بنا پر سرکاری مناصب حاصل کرتے ہیں، وہ چاہے عمر کے کسی مرحلہ میں ہوں، اس سے محروم ہوکر بے قرار ہوجاتے ہیں، کیا کہا جائے کہ اس وقت ہر چیز کی قیمت بڑھتی جارہی ہے، انسان اپنی ضروریاتِ زندگی خریدنے سے عاجز ہوتا جارہا ہے؛ لیکن ایک چیز ہے جو سستی ہوتی جارہی ہے، سستی سے سستی اور ارزاں سے ارزاں تر، اور وہ ہے کچھ لوگوں کا ضمیر، یہ ضمیر کے سوداگر ہیں اور کوڑیوں میں اپنا مال بیچتے ہیں، ان کے لئے ہدایت ہی کی دُعا کی جاسکتی ہے۔ وباللہ التوفیق وھو المستعان.

☆☆☆☆

غیرسودی بینکاری کے بنیادی اصول

مفتی محمد تقی عثمانی

سود کی حرمت کی جب بات چلتی ہے تو ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کل کاروبار زندگی کا سارا نظام بینکوں کے ذریعہ چل رہا ہے، اور بینکوں کا سارا کاروبار سود پر مشتمل ہے، لہٰذا اگر سود کو خلاف قانون قرار دیا جائے تو بینک کس طرح چل سکیں گے؟ اس سوال کا مفصل جواب تو درحقیقت ایک پوری کتاب کی وسعت چاہتا ہے، اور اردو عربی اور انگریزی میں اس موضوع پر بہت سی کتابیں آچکی ہیں، اور ہمارے ملک میں ماہرین معاشیات اور بینکرز کی ایک جماعت بلاسودی بینکاری کا تفصیلی نقشہ مرتب کرنے کے لئے کام بھی کررہی ہے، لیکن یہاں انتہائی اختصار کے ساتھ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ بلاسودی بینکاری کا ڈھانچہ کن بنیادوں پر استوار ہوسکتا ہے اور اس کے اساسی اصول کیا ہوں گے؟

موجودہ بینکوں کے کاروبار کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے کھاتہ داروں سے رقمیں جمع کرکے تاجروں، سرمایہ دار اور دستکاروں کو سود پر قرض دیتے ہیں، اسلامی نظام معیشت میں بینکوں کا یہ کاروبار سود کے بجائے 'شرکت' اور مضاربت' (Profit Sharing) کے اصول پر چلے گا، اس کی مختصر تشریح حسب ذیل ہے:

عوام کی طرف سے جو رقمیں بینک میں جمع ہوں گی وہ دو قسموں پر مشتمل ہوں گی، ایک عندالطلب کھاتے (Current Account) کی رقوم، دوسرے مد مضاربت (Fixed Deposit)، سیونگ اکاؤنٹ غیر سودی بینکاری میں عندالطلب کے اندر شامل ہوجائے گا۔

عبدالطلب کھاتے میں تمام رقوم بینک کے پاس فقہی نقطہ نظر سے قرض ہوگی، کھاتہ دار ہر وقت بذریعہ چیک ان کی واپسی کا مطالبہ کرسکے گا، لیکن اس کھاتے پر کوئی منافع کھاتہ دار کو نہیں کیا جائے گا، موجودہ نظام بینکاری میں بھی کرنٹ اکاؤنٹ پر عام

طور سے کھاتہ دار کو کوئی نفع نہیں دیا جاتا، البتہ مضاربت کے کھاتہ دار ایک متعین مدت کے لئے جو تین ماہ سے ایک سال تک ہوسکتی ہے، رقم رکھوائیں گے اور پھر اس رقم سے بینک جو منافع حاصل کرے گا اس میں متناسب (Proportionate) طور پر شریک ہوں گے، عبدالطلب اور مضاربت کھاتہ کے ذریعہ حاصل ہونے والی رقوم میں سے ایک حصہ بینک تو مد محفوظ (Reserve) کے طور پر رکھ کر باقی سرمایہ کاروباری افراد کو شرکت یا مضاربت کے اصول پر دے گا، یعنی ان سے یہ طے کرے گا کہ وہ بینک سے ملی ہوئی رقم سے جو نفع حاصل کریں گے اس کا کچھ فیصد بینک کو دیں گے، چنانچہ یہ کاروباری افراد اس سرمایہ کو صنعت یا تجارت میں لگا کر جو نفع حاصل کریں گے بینک اس نفع میں شریک ہوگا، اور نفع کا جو تناسب بھی باہمی رضامندی سے طے پائے گا مثلاً دس فیصد یا پندرہ فیصد، نفع کا اتنا حصہ بینک کو اصل رقم کے ساتھ واپس کریں گے، اور بینک یہ منافع اپنے حصہ داروں (Shares) اور کھاتہ داروں (Depositors) کے درمیان طے شدہ فیصد حصوں کی صورت میں تقسیم کریں گے۔

یہ طریق کار منصفانہ تقسیم دولت میں بہت معاون ثابت ہوسکتا ہے، کیونکہ بحالات موجودہ جب کوئی سرمایہ دار بینک سے قرض لے کر لاکھوں کا کاروبار کرتا ہے، تو اس کاروبار کا بیشتر نفع سرمایہ دار کے پاس مرکز ہوکر رہ جاتا ہے، بینک کو جو سود ملتا ہے وہ سرمایہ دار کے مجموعی منافع کے مقابلے بہت کم ہوتا ہے، لیکن مذکورہ صورت میں بینک چونکہ کاروبار میں براہ راست شریک ہوگا اس لئے کاروبار کے کے منافع کا کوئی حصہ بینک میں آئے گا، اسی طرح موجودہ نظام میں کھاتہ داروں کو سود کی جو رقم ملتی ہے وہ اس منافع کے مقابلہ میں بہت معمولی ہوتی ہے جو سرمایہ دار نے ان کی رقموں سے حاصل کیا ہے ، اس کے برعکس مذکورہ صورت میں کھاتہ دار براہ راست کاروبار میں شریک ہونے کی بناء پر زیادہ مقدار میں نفع کے مستحق ہوں گے، اور اس طرح دولت چند ہاتھ میں سمٹنے کے بجائے زیادہ وسیع دائرہ میں گردش کرے گی۔

البتہ بلاسود بینکاری میں جو عملی پیچیدگی عام طور سے بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے
کہ اس میں کھاتہ داروں یا بینک کو نفع کی سو فیصد ضمانت نہیں ہوسکتی بلکہ جن کاروباری افراد
نے قرض لیا ہے اگر ان کو خسارہ ہوجائے تو بینک اور کھاتہ داروں کو نفع کے ساتھ خسارہ بھی
برداشت کرنا پڑے گا، لیکن حقیقتاً یہ کوئی ایسی پیچیدگی نہیں ہے جسے بینکاری کے ماہرین حل
نہ کرسکیں، اور جس کی وجہ سے بلاسود بینکاری کے پورے نظام ہی کو ناقابل عمل قرار دے
دیا جائے، اول تو آج کل بڑے پیمانہ کی تجارتوں میں نفع کے امکانات زیادہ اور نقصان
کا احتمال بہت کم ہوتا ہے، اور بینک جب کسی کاروباری فریق سے معاملہ کرے گا تو وہ اس
کے مالی حالات، اس کے استحکام، دیانت اور کارکردگی کا اچھی طرح اطمینان کرکے ہی
اس کو رقم دے گا، آج کل بھی بینک کسی کو قرض دیتے وقت اس کی معاشی پوزیشن کا جائزہ
لیتا ہے، اس وقت اسے نسبتاً زیادہ اہتمام اور دقت نظر سے جائزہ لینا ہوگا جس کے تفصیلی
طریقے ماہرین طے کرسکتے ہیں، البتہ اگر وہ واقعتاً کسی کاروباری حادثے کی بناء پر کوئی
نقصان ہو ہی جائے تو اس کے لئے تمام بینک مل کر ایک ایسا امداد باہمی فنڈ (Mutual
Fund) قائم کرسکتے ہیں جو سود اور قمار سے خالی ہو، اور جس کے ذریعہ حتی الامکان بینک
اور کھاتہ داروں کے نقصان کی تلافی کی جاسکے، اس باہمی فنڈ کی تفصیلات بھی فنی ماہرین
طے کرسکتے ہیں۔

بینکاری کے موجودہ نظام میں بینک کے سارے کام سود پر مشتمل نہیں ہوتے،
بلکہ وہ بہت سی خدمات پر جائز اجرت بھی وصول کرتا ہے مثلاً مقفل صندوقوں
(Lockers) کا کرایہ، سفری چیک کا اجرا، بینک ڈرافٹ، اور لیٹر آف کریڈٹ جاری
کرنا، تجارتی اموال کو بلٹی کے ذریعہ منگوانا، بیع وشراء کی دلالی کرنا وغیرہ سارے کام بلاسود
بینکاری میں بدستور اجرت کی بنیاد پر جاری رہیں گے۔

یہ نہایت اجمالی طور پر بلاسود بینکاری کی بنیادیں ہیں، یہ بات تو ظاہر ہے کہ اب تک
چونکہ اس قسم کی بینکاری کا کوئی موثر عملی تجربہ نہیں ہوا اس لئے اس کی عملی تفصیلات اور اس کے

تمام جزوی پہلوؤں پر سنجیدگی کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے جس میں بینکاری کے
ماہرین اور علماء دین کا باہمی تعاون درکار ہے، اور اس کے باوجود جزوی طور پر اس نظام کو مختلف
تجربات سے گزرنا پڑے گا، لیکن یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ موجودہ نظام بینکاری ایک
دن میں بن کر کھڑا نہیں ہوگیا، بلکہ صدیوں کے تجربات اور ردوبدل کے بعد وہ موجودہ مقام
تک پہونچا ہے، اس لئے محض اس بناء پر اسے ناقابل عمل قرار دینا کسی طرح درست نہیں کہ
اب تک اس کا کوئی عملی تجربہ نہیں ہوسکا، محض مشکلات کا ہوا ذہن میں سوار کرلینے سے کسی
انقلابی اصلاح کی توقع نہیں کی جاسکتی، اگر ہمیں ایک آزاد مسلمان قوم کی طرح جینا ہے تو ہمت
کرکے یہ قدم اٹھانا ہی پڑے گا، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

سافٹ ڈرنک سے ذیابطیس کا خطرہ: ڈاکٹر اشفاق احمد

ذیابطیس کی روک تھام کے لئے کام کرنے والی ایک رضا کار تنظیم کا کہنا ہے کہ شکر آمیز خوراک
یا مشروب کو کم کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اس میں نسبتاً زیادہ حرارے (کیلوریز) ہوتی
ہیں، اور اس سے وزن میں اضافہ ہوسکتا ہے، یہ تازہ تحقیق برطانیہ،
جرمنی، ڈنمارک، اٹلی، اسپین، سویڈن، فرانس اور نیدرلینڈ کے سائنس دانوں نے کی ہے، اس
کے تحت قریب تین لاکھ پچاس ہزار افراد سے اس کی روزانہ کی خوراک کے بارے میں
معلومات حاصل کی گئی، تاکہ یورپ میں وسیع پیمانہ پر خوراک اور کینسر کے تعلق پر روشنی
پڑسکے، امپیریئل کالج لندن کی ڈورا رومو گیورا اس تحقیق کی رہنمائی کررہی ہیں، انہوں نے کہا کہ
شکر آمیز سافٹ ڈرنک سے ذیابطیس کا خطرہ بڑھ جاتا ہے، اور ایک دن میں آپ جتنا زیادہ
سوفٹ ڈرنک پئیں گے اسی مناسبت سے ذیابطیس کا خطرہ بڑھے گا، ٹائپ دوم ذیابطیس سے
محفوظ رہنے کے لئے یہ اہم ہے، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ صحت مند وزن ہی اس سے بچنے
کا واحد طریقہ ہے، انہوں نے شکر آمیز ملکے مشروب کے اثرات کے بارے میں وسیع
معلومات فراہم کرنے پر زور دیا، مصنوعی طور پر میٹھی بنائی گئی سافٹ ڈرنک سے ذیابطیس کے
مرض کا تعلق ہے، لیکن قد اور وزن کے اعتبار سے بی آئی ایم سے اس کا تعلق نظر نہیں آتا۔

غیر مسلموں سے تعلقات۔ اسلامی نقطہ نظر

مولانا نوشاد عالم ندوی

(استاد جامعۃ المؤمنات الإسلامیہ، لکھنؤ)

اسلام دین رحمت ہے اور اس کا پورا نظام عدل وانصاف پر قائم ہے۔ وہ اپنے پیروکاروں کو بلاوجہ تشدد اختیار کرنے اور ناحق دوسروں پر ظلم وزیادتی کرنے سے روکتا ہے۔ چناں چہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى ۝ (المآئدہ:۸)

''کسی قوم کی عداوت تمھیں خلافِ عدل پر آمادہ نہ کردے، عدل کیا کرو جو پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔''

لیکن بعض ناعاقبت اندیش مسلمان اللہ کے اس فرمان کو نظر انداز کرتے ہوئے تمام غیر مسلموں کو مسلمانوں کے تعلق سے ان کے موقف کے درمیان فرق کیے بغیر ایک ہی صف میں شمار کرتے ہیں اور یہ دلیل پیش کرتے ہیں: **الکفر ملة واحدة** ''سارا کفر ایک ہی ملت ہے'' اور اسی بنیاد پر تمام غیر مسلموں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ جب کہ ان میں اچھے لوگ بھی ہیں اور برے بھی، ظالم بھی ہیں اور انصاف پسند بھی، مسلمانوں کے تعلق سے نرم گوشہ رکھنے والے اور ان کی حمایت کرنے والے بھی ہیں اور وہ بھی جو ہر لحہ مسلمانوں کو تکلیفیں پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں اور ان کی دشمنی میں زہر اگلتے رہتے ہیں۔

جو لوگ تمام غیر مسلموں کو برابر سمجھتے ہیں اور ان کے موقف کے درمیان فرق کیے بغیر ان کے بارے میں سخت موقف رکھتے ہیں، وہ اپنے اس نقطۂ نظر کی تائید میں قرآن کریم کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

وَلَن تَرْضَى عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَى ۝ (البقرہ:۱۲۰)

''آپ سے یہود ونصاریٰ ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے تابع نہ بن جائیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔''

اس میں شک نہیں کہ اس آیت میں ''**ملتهم**'' سے اس طرف اشارہ ہے کہ کفر ملت واحدہ ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ **لکم دينكم ولي دين** سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے لیکن کفر میں ان کے ایک ہی ملت ہونے کے باوجود وہ سب ایک جیسے نہیں ہیں کیوں کہ مسلمانوں کے مسائل ومعاملات کے تعلق سے ان کے درمیان موقف میں فرق پایا جاتا ہے اور اسی اعتبار سے دنیا میں ان کے ساتھ ہمارے تعلقات کی حیثیت میں بھی فرق ہوگا کیوں کہ ان میں دوست بھی ہیں اور دشمن بھی، ایسے ظالم بھی ہیں جو مسلمانوں کی ایذا رسانی کی فکر میں رہتے ہیں اور ایسے صلح پسند اور غیر جانب دار بھی ہیں جو مسلمانوں کو ایذا پہنچانے سے گریز کرتے ہیں۔ چناں چہ اگر وہ نفع نہیں پہنچاتے تو نقصان بھی نہیں پہنچاتے ہیں اور اسلام نے شر سے باز رہنے کو بھی ایک قسم کی نیکی قرار دیا ہے۔ غیر مسلموں میں ایسے نیک دل انسانوں کی کمی نہیں ہے جو ظلم کو ناپسند کرتے ہیں اور مذہب وملت اور رنگ ونسل کی تفریق کے بغیر مظلوموں کی حمایت اور مدد کرتے ہیں۔ اس لیے غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی سطح پر اس فرق کو ملحوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں ہر قسم کے فساد وبگاڑ اور ہر طرح کی خرابیوں کے باوجود کچھ ایسے نفوس بھی تھے جو انسانیت کا درد رکھتے تھے، انصاف پر قائم تھے، مظلوم کی مدد کرتے تھے۔ ان ہی میں سے وہ جماعت بھی تھی جس نے شعب ابی طالب کے بائیکاٹ کے اعلان کو پھاڑنے کے لیے ایک دوسرے کو آواز دی اور شعب ابی طالب کے اس تین سالہ طویل اور سخت ترین محاصرے کو حضور پاک ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے

ختم کرانے میں اہم رول ادا کیا۔ اسی طرح اسلام کی روشنی نمودار ہونے سے پہلے جب وہ لوگ زمانۂ جاہلیت کی گھٹاٹوپ تاریکیوں میں زندگی بسر کر رہے تھے اس وقت بھی ان لوگوں نے مظلوموں کی حمایت اور مدد کے لیے عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہو کر حلف الفضول نامی معاہدہ کیا تھا، جس میں اولادِ آدم کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بہ نفسِ نفیس موجود تھے اور بعثت کے بعد ان الفاظ میں اس معاہدے کی تعریف کیا کرتے تھے:

"شهدت حلف المطيبين مع عمومتي وأنا غلام فما أحب أن لي حمر النعم وأني أنكثه"

"میں مطیبین (عطر والے) کے معاہدے میں اپنے چچاؤں کے ساتھ موجود تھا اس وقت میں ایک چھوٹا لڑکا تھا۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ مجھے اس کے بدلے میں سرخ اونٹ ملے اور میں اس معاہدے کو توڑ دوں۔"

مذکورہ واقعات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کفار سب کے سب برابر نہیں ہیں اور دنیا میں اہل کفر کے درمیان برابری عقلی، حسی اور شرعی کسی طور پر بھی قابل تسلیم نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یکساں اور برابر پیدا ہی نہیں کیا ہے، چناں چہ عقلی طور پر یہ بات کیسے درست ہو سکتی ہے کہ ہم اچھے اور برے، انصاف پسند اور مجرم دونوں کو برابر قرار دیں جب کہ یہ برابر ہو ہی نہیں سکتے؟ حسی طور پر بھی یہ بات نادرست ہے کیوں کہ اہل کفر برابر نہیں ہیں اور جب یہ حقیقت ہے تو ان کے درمیان برابری قائم کرنا ظلم اور ناانصافی ہے بلکہ ایسا کرنا حماقت اور بے وقوفی ہے، جس سے امت کے مصالح کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور جو مسلمانوں کے دشمن نہیں ہیں ان کو دشمنی پر آمادہ کرنے کے مرادف ہے۔ حالاں کہ ہمیں تو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنے اور ان کے درمیان کی دشمنی کو احسن طریقے سے ختم کریں تاکہ ان کی دشمنی محبت میں بدل جائے۔ تو کیا اس کے باوجود ہم ایسے صلح پسند لوگوں کو جو مسلمانوں

کے لیے معاون ثابت ہو سکتے ہیں اور ان کے مسائل کو حل کرنے میں مددگار بن سکتے ہیں دشمن بنالیں، کیا یہ غلط تصور نہیں ہے؟ اور ایسی سیاست حکمت و مصلحت کے خلاف نہیں ہے؟ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ ہمارے دین کی بنیاد شریعت پر ہے نہ کہ عقل پر، تو ہم اس کا جواب اس طرح دے سکتے ہیں کہ شریعت خود بھی اس بات کو بڑی تاکید کے ساتھ واضح کرتی ہے کہ کفار سب کے سب برابر نہیں ہیں۔ چناں چہ شریعت ہمیں عدل و انصاف کا حکم دیتی ہے اور یہ بات عدل کے خلاف ہے کہ اچھے انسان کو برے انسان کی صف میں شمار کیا جائے۔ انسانوں کی اس فطری تقسیم کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ابولہب جیسے ظالم انسان کو ابوطالب جیسے رحم دل انسان کے برابر شمار کیا جائے، کیوں کہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے چچا ہیں اور دونوں کافر و مشرک ہیں، تو کیا یہ دونوں مرتبے میں برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح عثمان بن طلحہ کی غیرت، پاک دامنی اور امانت داری کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے، جب وہ مدینہ طیبہ کی ہجرت میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تھے؟ وہ کیا کہا کرتی تھیں "خدا کی قسم میں اسلام میں کسی گھرانے کو نہیں جانتی جن کو ایسی مصیبت لاحق ہوئی ہو جیسی ابوسلمہ کے خاندان کو لاحق ہوئی اور میں نے کسی شخص کو کبھی نہیں دیکھا جو عثمان بن طلحہ سے زیادہ نیک اور کریم ہو۔" حالاں کہ وہ اس وقت کافر تھے۔ پھر اللہ نے ان کو اسلام سے سرفراز فرمایا۔

جہنم میں کفار کے درجات میں تفاوت

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کفار آخرت میں یقینی طور پر جہنم میں ہوں گے اور جو بھی توحید اور اسلام قبول کیے بغیر مرے گا، وہ یقینی طور پر جہنم میں جائے گا، لیکن جہنم بھی ایک طبقہ نہیں ہے، اس کے بھی مختلف طبقات ہیں، جو جہنم کے پہلے طبقے میں ہوں گے وہ ان کی طرح نہیں ہوں گے، جو جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔ اللہ عزوجل کا فرمان ہے:

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ نَصِيراً

(النسآء:۱۴۵)

’’منافق تو یقیناً جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے، ناممکن ہے کہ تو ان کا کوئی مددگار پالے۔‘‘

یعنی جہنم والے اگر چہ عذاب میں مشترک ہوں گے، مگر ان کے درجات میں تفاوت ہوگا۔ بعض کا عذاب بعض سے ہلکا ہوگا۔ جو جہنم کی گہرائی میں ہوگا وہ اس کی طرح نہیں ہوگا جو جہنم کے اوپری حصے میں ہوگا۔ اس کی تائید حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے اپنے چچا ابوطالب کو کچھ فائدہ پہنچایا؟ وہ تو آپ کی پشت پناہی کرتے تھے اور آپ کے لیے دوسروں سے ناراض ہوتے تھے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا ہاں! وہ جہنم کی آگ کے اوپری حصے میں ہیں۔ اگر میں نہ ہوتا تو وہ آگ کے نچلے حصے میں ہوتے۔ اس حدیث میں ابوطالب سے عذاب کی تخفیف کا سبب ان کا اپنے بھتیجے حضور پاک ﷺ کی مدد کرنا ہے۔

قرآن کریم کی بہت سی آیتوں سے پتا چلتا ہے کہ جہنم میں کفار کے درجات میں فرق ہوگا اور وہ سب ایک ہی درجے میں نہیں ہوں گے۔ چناں چہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولکل درجات مما عملوا۔ ’’ہر ایک کو ان کے اعمال کے سبب درجے ملیں گے۔‘‘ یعنی ہر انسان اور جن کے ان کے باہمی درجات میں عملوں کے مطابق فرق و تفاوت ہوگا، اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے:

الَّذِينَ كَفَرُواْ وَصَدُّواْ عَن سَبِيلِ اللّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَاباً فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُواْ يُفْسِدُونَ ○ (النحل:۸۸)

’’جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا ہم انھیں عذاب بڑھاتے جائیں گے، یہ بدلہ ہوگا ان کی فتنہ پردازیوں کا۔‘‘

یعنی جس طرح جنت میں اہل ایمان کے درجات مختلف ہوں گے اسی طرح جہنم میں کفار کے عذاب میں تفاوت ہوگا۔

علامہ ابن کثیرؒ آیت کریمہ ’’ھل یجزون الا ما کانوا یعملون‘‘ کے ضمن میں رقم طراز ہیں: ’’انما نجازیکم باعمالکم کل بحسبه، للقادة عذاب بحسبهم، وللأتباع بحسبهم‘‘ یعنی ہم تمھارے اعمال کا بدلہ اس طرح دیں گے کہ ہر ایک کو اس کے مقام کے اعتبار سے بدلہ ملے گا، قائدین کو ان کے اعتبار سے عذاب دیا جائے گا اور متبعین کو ان کے اعتبار سے۔

ولاء اور براء کے متعلق غلط فہمی

اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ کفر ملت واحدہ ہے اور بعثت محمدیہ کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام کے علاوہ کوئی اور دین قابل قبول نہیں ہے۔ اسلام ہی دین حق ہے اور حق کے بعد صرف گم راہی ہے، لیکن جو بات قابل غور ہے وہ یہ کہ بعض لوگ بلا تفریق تمام غیر مسلموں کو دنیاوی اعتبار سے برابر سمجھتے ہیں، ان سے نفرت و بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مشرکین سے براءت کا یہی تقاضا ہے، حالاں کہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کے اعتبار سے ان کی مختلف قسمیں ہیں، ان میں محارب بھی ہیں اور معاہد بھی، دشمن بھی ہیں اور دوست بھی، خائن بھی ہیں اور امانت دار بھی۔ ایسی حالت میں ان کے ساتھ یکساں معاملہ کس طرح کیا جاسکتا ہے اور ان کے درمیان برابری کس طرح قائم کی جاسکتی ہے؟ اللہ ہی نے ہمیں خبر دی ہے کہ ان میں امانت دار بھی ہیں اور خائن بھی اور یہ سلسلہ اس وقت سے قائم ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی تخلیق فرمائی ہے، چناں چہ اللہ سبحانہ و تقدس کا ارشاد ہے:

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِن تَأْمَنْهُ بِقِنطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُم مَّنْ إِن تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَّا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِماً (آل عمران:۷۵)

"بعض اہلِ کتاب تو ایسے ہیں کہ انھیں تو خزانے کا امین بنادے تو بھی وہ تجھے واپس کردیں اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر تو انھیں ایک دینار بھی امانت دے تو وہ تجھے ادا نہ کریں، ہاں یہ اور بات ہے کہ تو اس کے سر پر ہی کھڑا رہے۔"

اس آیت کریمہ کے ضمن میں سید قطبؒ تحریر فرماتے ہیں "یقیناً یہ انصاف اور حق کی بات ہے جسے قرآن کریم نے اس وقت کے اہل کتاب کے تعلق سے بیان کیا ہے۔ اس وقت اہل کتاب اسلام اور مسلمانوں کے مد مقابل تھے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خطرناک قسم کی سازشیں کررہے تھے اور ہمیشہ ان کو نقصان پہنچانے کی فکر میں رہتے تھے، اس کے باوجود قرآن کریم نے ان میں سے اچھے لوگوں کے حق کو بیان کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور برسرپیکار ہونے کی حالت میں بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔"

اصل امن ہے نہ کہ جنگ

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو کفار سے قتال کا حکم دیا گیا ہے اور اپنی تائید میں یہ آیت پیش کرتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ قَاتِلُواْ الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُواْ فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُواْ أَنَّ اللّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ○ (التوبہ:۱۲۳)

"اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمھارے آس پاس ہیں اور ان کو تمھارے اندر سختی پانا چاہیے اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کے ساتھ ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو ان کفار و مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا ہے جو ہم سے قتال کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، چناں چہ ان سے قتال کا سبب ان کا کفر نہیں ہے بلکہ قتال کا اصل سبب اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے زمین سے فتنے کو ختم کرنا ہے اور فتنے سے مقصود اسلام سے روکنا ہے، چناں چہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

ترجمہ: "ان سے لڑو جب تک کہ فتنہ نہ مٹ جائے اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہ آجائے، اگر یہ رک جائیں تو تم بھی رک جاؤ، زیادتی تو صرف ظالموں پر ہی ہے، حرمت والے مہینے حرمت والے مہینوں کے بدلے ہیں اور حرمتیں ادلے بدلے کی ہیں، وہ تم پر زیادتی کریں تو تم بھی ان پر اسی کے مثل زیادتی کرو جو تم پر کی ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو، دھیان رکھو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔"

لہٰذا جو لوگ اللہ کے دین کو قائم کرنے سے مسلمانوں کو نہ روکتے ہوں ان سے قتال کی اجازت نہیں ہے، اس لیے کہ ان کے کفر سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے، ان کا کفر خود ان کے لیے نقصان دہ ہے، یہی جمہور فقہاء اسلام کا قول ہے اور کتاب و سنت بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَاتِلُواْ فِي سَبِيلِ اللّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ إِنَّ اللّهَ لاَ يُحِبِّ الْمُعْتَدِينَ ○ (البقرہ:۱۹۰)

"لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو، اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔"

جو قتل کیے جانے کے مستحق ہیں ان سے آگے بڑھ کر ان لوگوں کو قتل کرنا جو قتل کے مستحق نہیں ہیں جیسے عورتیں، بچے، بوڑھے اور کنارہ کشی اختیار کرنے والے، یہ ایک قسم کی زیادتی ہے اور یہ زیادتی از روئے شریعت ناجائز ہے۔ مذکورہ آیت جہاد کی مشروعیت کے لیے ایک ثابت اصل اور قاعدہ کلیہ ہے جو عموم اور ثبات کی صفت سے متصف ہے، جب کہ دوسری آیتوں سے تناقض اور اختلاف کا وہم ہوتا ہے۔ یہ آیت ایک متعین تاریخی پس منظر میں ایک برسرپیکار دشمن کے سلسلے میں نازل ہوئی۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک رہی تھی، یہ آگ چوں کہ مشرکین نے ہی بھڑکائی تھی اس لیے جب بھی یہ بجھنے لگتی وہ لوگ دوبارہ اسے بھڑکادیتے، لہٰذا ان آیات کو دوسرے بے گناہ اور صلح

پسند لوگوں پر منطبق کرنا اوران سے دشمنی اور جنگ کرنے کے لیے دلیل بنانا درست نہیں ہے، کیوں کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات میں اصل امن ہے نہ کہ جنگ۔ البتہ مسلمانوں کے لیے ایسی قوت کا ہونا ضروری ہے، جس سے اپنا دفاع کرسکیں اس لیے قوت وطاقت حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شیخ ابوزہرہ اپنی کتاب ”العلاقات الدولية في الاسلام“، میں تحریر فرماتے ہیں: تعلقات میں اصل امن و سلامتی ہی ہے، اسلام اپنے پیروکاروں کو دوسروں کے معاملات میں بلاضرورت مداخلت کی اجازت نہیں دیتا۔

کفار کے ساتھ عدل کرنا واجب ہے

اسلام میں ہر ایک کے ساتھ عدل کرنا واجب ہے اور نفرت وکراہیت کے جذبے سے کسی کے ساتھ زیادتی کرنا بالکل جائز نہیں ہے۔ اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ کسی دشمن کی دشمنی کے نتیجے میں اس کے ساتھ ظلم کیا جائے، چناں چہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ”جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی اور تمھیں جلاوطن نہیں کیا ان کے ساتھ سلوک واحسان کرنے اور منصفانہ بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمھیں نہیں روکتا ہے، اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“ (الممتحنۃ:۸)

اسی طرح قرآن کریم نے کافر والدین کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَى أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا○ (لقمان:۱۵)

”اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ شریک کرے جس کا تجھے علم نہ ہو تو ان کا کہنا نہ ماننا، ہاں دنیا میں ان کے ساتھ اچھی طرح بسر کرنا۔“

صحیحین اور حدیث کی دیگر کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ اسماء قتیلہ عبدالعزی

کی بیٹی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے جاہلیت میں ان کو طلاق دے دی تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد صلح کے زمانے میں ہی وہ اپنی بیٹی اسماء بنت ابوبکر کے پاس کچھ ہدیہ وغیرہ لے کر آئیں، چوں کہ وہ مشرکہ تھیں اس لیے حضرت اسماء بنت ابوبکر، جو ان کی لخت جگر تھیں، نے ان سے کہا نہیں میں آپ کا ہدیہ قبول نہیں کروں گی اور آپ میرے پاس اس وقت تک تشریف نہ لائیں جب تک کہ میں رسول اللہ ﷺ سے آپ کے بارے میں اجازت طلب نہ کرلوں۔ چناں چہ وہ گئیں اور آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ میری والدہ میرے پاس تشریف لائیں ہیں، وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں، کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کرسکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا:”نعم صلی امك“ ہاں تم اپنی والدہ کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔

یہ ہے ہمارا دین جو تمام کافروں کے ساتھ بہ طور خاص کافر والدین کے ساتھ نیکی، بھلائی، امن وآشتی، صلہ رحمی ورواداری کا حکم دیتا ہے، جب تک کہ وہ زیادتی نہ کریں۔ یہ حقیقت ہے کہ دین اسلام اپنی وسعت، رواداری اور انسانیت نوازی میں اتنی بلندی تک پہنچا ہوا ہے کہ اس نے مسلمانوں کے لیے اہل کتاب کا ذبیحہ کھانے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کو مباح قرار دیا ہے۔

تعجب ہے ان لوگوں پر جو بغیر سمجھے بوجھے اسلام پر کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں اور اس کو جبر وقہر، ظلم وجور اور تشدد وزیادتی کا مذہب قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں مسلمانوں کے تعلق سے ان کے موقف کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھیں، ان کے انصاف پسند لوگوں سے فائدہ اٹھائیں اور ان کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کریں تاکہ امت مسلمہ کے عالمی مسائل کو حل کرنے میں وہ مددگار ثابت ہوں۔

آئندہ کے شمارہ میں

سیرت نبوی سے متعلق گوشہ ضرور پڑھیں

اسلام کا نظام طلاق

منور سلطان ندوی

(رفیق علمی دارالافتاء، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

مذہب اسلام کی سب سے بڑی خوبی اور اس کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس کی تعلیمات انسانی ذہن کا تیار کردہ نہیں، اور نہ ہی یہ زمانہ کے تجربات کا نتیجہ ہیں بلکہ یہ تعلیمات ہیں اس ذات برحق کی جس نے یہ کائنات بنائی، جس نے انسانوں کو پیدا کیا اور اس کے لئے تمام تر سہولتیں پیدا کیں، انسان کو پیدا کرنے والا انسان کے مزاج اور مذاق اس کی ضرورتوں سے زیادہ واقف ہے، جس نے دنیا کا نظام بنایا اسی ذات برحق نے دنیا میں انسان کے رہنے کا طریقہ بھی بتایا، انہی کے بتائے ہوئے طریقہائے زندگی کے آخری ایڈیشن کا نام 'شریعت محمدی' ہے، رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ بعثت کی تکمیل ہوگئی، اور یہ شریعت ہمیشہ ہمیش کے لئے انسانی رہنمائی کے لئے باقی رہے گی، انسان کی کامیابی وکامرانی شریعت کے اتباع میں مضمر ہے۔

اسلامی شریعت کا اصل مصدر وسرچشمہ قرآن وحدیث ہے، اور پھر ان دونوں مصادر کی روشنی میں اجماع اور قیاس کا وجود ہوتا ہے، انسانی زندگی کے تمام مسائل انہی چاروں مصادر سے ماخوذ ہیں، زندگی کے مختلف ابواب سے متعلق جو احکامات دئے گئے ہیں ان میں بعض منصوص ہیں، آیات بھی اور آحادیث بھی، ان منصوص مسائل میں انسانی عقل وفکر کا کوئی دخل نہیں ہے، مثلا نماز کے اوقات، نماز کی رکعات، زکوۃ کی مقدار وغیرہ، اور بہت سے مسائل ایسے ہیں جن سے متعلق قرآن وحدیث میں نص تو موجود ہے، مگر وہ صریح نہیں ہے، ایسے مسائل میں صحابہ کرام، خلفاء راشدین، کبار تابعین اور پھر ائمہ مجتہدین نصوص اور اجتہاد کے اصول وضوابط کی روشنی میں اجتہاد کرکے مسائل مستنبط

کرتے ہیں، زندگی کے تمام ابواب مثلا عبادات، معاملات، عائلی مسائل، مالی مسائل، جنایات وغیرہ کے احکام انہی دوطرح کے مسائل پر مشتمل ہیں۔

اسلامی شریعت میں عائلی مسائل مثلا نکاح وطلاق، عدت، نفقہ، حضانت، اور میراث ووصیت وغیرہ کا پورا نظام موجود ہے، ان میں سے ہر باب سے متعلق کلی اور جزئی تمام مسائل متعین ہیں، اور سارے احکامات خدائی احکامات ہیں، اس لئے یہ انسانی مصالح اور ان کی ضروریات کے مکمل مطابق ہیں، یہی سب سے بہتر نظام حیات ہے، اس سے بہتر تو کیا اس کے مقابلہ میں انسانی فکر کا تخلیق کردہ کوئی نظام یا ازم ہو بھی نہیں سکتا ہے۔

شریعت میں جہاں نکاح کا پورا نظام بتایا گیا وہیں میاں بیوی کے درمیان نزاع اور اختلافات کو دور کرنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے، نکاح کے ذریعہ دو اجنبی ایک رشتہ میں بندھ جاتے ہیں اور ایک ہوجاتے ہیں، پھر دونوں کے مابین اکثر اچھی ہم آہنگی ہوجاتی ہے، اور دونوں خوشی خوشی ایک ساتھ رہتے ہیں، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مزاج کے فرق، اور دیگر اسباب کی بناء پر ہم آہنگی نہیں ہو پاتی، جس کے نتیجہ میں دونوں کے مابین ایک خلیج حائل ہونے لگتی ہے، کبھی ایک دوسرے کو سمجھانے، خاندان کے بڑوں کے سمجھانے یا ایک دوسرے کے تئیں نرم پڑنے کی صورت میں یہ اختلافات ختم ہوجاتے ہیں اور کبھی یہ اختلافات مزید بڑھ جاتے ہیں، یہاں تک دونوں کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے، دو افراد کی لڑائی میں پورا خاندان متاثر ہونے لگتا ہے، ان ناخوش گوار صورتوں اور پیچیدہ عائلی مسائل کے حل کا طریقہ بھی قرآن نے بیان کیا ہے۔

میاں بیوی کے مابین اختلاف کو دور کرنے کا طریقہ

زوجین کے درمیان درآنے والے اختلافات اور شقاق کو دور کرنے کا جو طریقہ قرآن میں بتایا گیا ہے ان کو اپنانا چاہیے، اور ان مراحل کو پورا کرنے کے بعد ہی طلاق کا فیصلہ کرنا چاہیے، آپسی معاملات کو سلجھانے کا طریقہ درج ذیل ہے:

۱۔ بیوی کے ساتھ حسن سلوک: قرآن میں بیوی کے ساتھ حسن سلوک کا حکم باربار

آیا ہے: عاشروھن بالمعروف (سورہ نساء:۱۹)

ترجمہ: اور بہنوں کے ساتھ خوش اسلوبی سے گزر بسر کیا کرو۔

شوہر بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرے تو بہت سے مسائل یا تو پیدا ہی نہیں ہوتے یا پیدا ہونے کے بعد حل ہو جاتے ہیں، عورتیں شوہر یا سسرال کی بعض ناگوار باتوں کو شوہر کے حسن سلوک کی وجہ گوارا کر لیتی ہیں۔

۲۔میاں بیوی ایک دوسرے سے متعلق تکلیف کو برداشت کریں: قرآن میں صبر کرنے اور باہم نزاع کی صورت میں برداشت کرنے اور انگیز کرنے کا حکم ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اگر تمہیں کوئی ایک چیز بری لگی تو دوسری چیز اچھی لگے گی:

عاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسی ان تکرھوا شیئا ویجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا (سورہ نساء:۱۹)

ترجمہ: بیویوں کے درمیان خوش اسلوبی سے گزر بسر کیا کرو، اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو عجب کیا کہ تم ایک شئی کو ناپسند کرو اور اللہ تعالی اس کے اندر کوئی بڑی بھلائی رکھ دے۔

صحیح مسلم کی روایت ہے: لایفرك مومن مومنة ان کرہ منھا خلقا رضی منھا اخری (صحیح مسلم)

۳۔میاں بیوی ایک دوسرے کو سمجھائیں، اس طرح بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

۴۔بستر الگ کر کے اعراض کرنا: اگر افہام وتفہیم سے باہمی اختلافات دور نہ ہوں تو حکم ہے کہ مرد اپنا بستر الگ کر لیں، اس طرح اعراض کرنے کی صورت میں سمجھدار بیوی مسائل پر غور کرنے پر مجبور ہوگی، اور شوہر کی شکایات کو دور کرنے کی کوشش کرے گی۔

۵۔معمولی تادیب: اس کے بعد بھی کام نہ چلے اور بیوی کی نادانی اور جہل بڑھتا جائے تو معمولی انداز سے مارنے کا بھی حکم ہے، احادیث میں مارنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے۔

ان اقدام کے بعد اگر مصالحت ہو جاتی ہے تو مردوں کو حکم ہے کہ اب کوئی الزام عورت کو نہ دیں بلکہ خوشی خوشی ساتھ رہیں، ارشاد ہے:

والـلاتی تخافون نشوزھن فعظوھن واھجروھن فی المضاجع واضربوھن فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلا ان اللہ کان علیا کبیرا (سورہ نساء:۳۴)

ترجمہ: اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم ان کی سرکشی کو علم رکھتے ہو تو انہیں نصیحت کرو اور انہیں خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو، اور انہیں مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو ان کے خلاف بہانے نہ ڈھونڈو، بے شک اللہ بڑا ہی رفعت والا بڑا ہی عظمت والا ہے۔

۶۔دونوں خاندان کے کچھ افراد جمع ہوں اور مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں: ان مراحل کے بعد بھی اگر مسائل حل نہ ہوں تو آگے حکم ہے کہ دونوں طرف کے ذی ہوش اور معاملہ فہم افراد جمع ہوں اور میاں بیوی کی باتیں سن کر جو مناسب سمجھیں فیصلہ کریں، اللہ تعالی فرماتے ہیں اگر دونوں حکم مصالحت کرنا چاہیں گے تو ضرور اللہ تعالی انہیں مصالحت کی توفیق عطا فرمائے گا:

وان خفتم شقاق بینھما فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا ان یریدا اصلاحا یوفق اللہ بینھما ان اللہ کان علیما خبیرا (سورہ نساء:۳۵)

ترجمہ: اور اگر تمہیں دونوں کے درمیان کشمکش کا علم ہو تو تم ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک حکم عورت کے خاندان سے مقرر کرو، اگر دونوں کی نیت اصلاح حال کی ہو تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا، بے شک اللہ بڑا ہی علم رکھنے والا اور ہر طرح سے باخبر ہے۔

ان مراحل سے گزرنے کے بعد بھی اگر آپسی ناچاقی باقی رہے تو اب شوہر کو ایک طلاق رجعی دینے کا اختیار ہوگا۔

یہاں یہ واضح رہے کہ میاں بیوی کی آپسی ناچاقی کو دور کرنے کی جو مذکورہ ہدایات قرآن نے دی ہیں یہ اختیاری ہیں، لزومی نہیں، یعنی اگر کوئی ان مراحل کے بغیر طلاق دے دیتا ہے تو طلاق واقع ہو جائے گی، البتہ مذکورہ ہدایات پر عمل نہ کرنے کا گنہگار ہوگا۔

طلاق کی حیثیت

طلاق کی مشروعیت ضرورتاً ہوئی ہے، ورنہ اللہ تعالی کے نزدیک یہ بہت ہی ناپسندیدہ عمل ہے، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

ابغض الحلال الی اللہ تعالی الطلاق۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی کراہیۃ الطلاق، حدیث نمبر:۲۱۸۰)

اللہ تعالی کو حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے۔

جائز چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ اور اللہ تعالی کو غصہ دلا والی چیز طلاق ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ما احل اللہ شیئا ابغض الیہ من الطلاق۔ (سنن ابی داؤ، کتاب الطلاق، باب فی کراہیۃ الطلاق، حدیث نمبر:۲۱۷۹، المستدرک علی الصحیحین، کتاب الطلاق، ج۲، ص:۲۱۴، حدیث نمبر:۲۷۹۴)

ایک روایت میں طلاق کے بارے میں بڑا سخت لفظ آیا ہے:

تزوجوا ولا تطلقوا فان الطلاق یھتزلہ عرش الرحمن۔

(الفوائد المجموعہ لاحادیث الموضوعۃ، ج۱، ص:۱۳۹)

نکاح کرو، طلاق نہ دیا کرو، کیونکہ طلاق سے اللہ رب العزت کا عرش ہل جاتا ہے۔

اس روایت کو محدثین نے ضعیف کہا ہے۔ (حوالہ سابق)

طلاق کی تعریف

نکاح کے ذریعہ میاں بیوی کے درمیان جو رشتہ وجود میں آتا ہے اس کو ختم کرنے کا نام طلاق ہے، رفع قید النکاح حالا او مآلا بلفظ مخصوص (الفتاوی الہندیۃ، ج۱، ص:۳۴۸)

طلاق کی مشروعیت کی دلیل

قرآن کی متعدد آیات سے طلاق کا مشروع ہونا معلوم ہوتا ہے، مثلاً:

الطلاق مرتان فامساك او تسريح باحسان، (سورہ بقرہ:۲۲۹)

ترجمہ: طلاق تو دو ہی بار ہے، اس کے بعد یا تو رکھ لینا ہے قاعدہ کے مطابق یا خوش اسلوبی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔

یاایھاالنبی اذاطلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن (سورہ طلاق:۱)

ترجمہ: اے نبی! جب ت اپنی عورتوں کو دینے لگو جن کے خلوت ہو چکی ہے تو ان کو عدت سے پہلے طلاق دو۔

احادیث میں اس موضوع پر کثرت سے روایتیں موجود ہیں، مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنی زوجہ کو طلاق دیا تو حضرت عمر نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: مرہ فلیراجعھا ثم یطلقھا اذا طھرت...... (صحیح البخاری، کتاب الطلاق، باب قولہ یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء، حدیث نمبر:۵۲۵۱)

تمام مسلمان طلاق کے مشروع ہونے کے قائل ہیں، علامہ ابن قدامہ نے طلاق کے جائز ہونے پر مسلمانوں کا اجماع نقل کیا (المغنی، ج۷، ص:۹۶)

انسانی عقل کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ طلاق ہو، کیونکہ شوہر و بیوی کے درمیان جب ہم آہنگی نہ ہو، اور نکاح کے رشتہ کو باقی رکھنا ممکن نہ ہو، ایسی صورت میں نکاح کی بنیاد پر بیوی کو روکے رکھنا جس کے ساتھ رہنا ممکن نہ ہو، نکاح کے مقصد کو ختم کرنا ہے، اور ان مصالح کو ضائع کرنا ہے جن کے تکمیل کی خاطر نکاح کی مشروعیت ہوئی ہے۔

طلاق کی حکمت

اللہ تعالی نے اہم مقاصد کی تکمیل کے لئے نکاح کو مشروع فرمایا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ نکاح سے جو مقاصد مطلوب ہیں وہ اسی صورت میں پورے ہوسکتے ہیں جب شوہر و بیوی کے درمیان اچھے تعلقات ہوں، حسن معاشرت ہو، باہم محبت ومودت ہو، ایک دوسرے کے لئے ہمدردی ہو، شریعت میں حسن معاشرت کی بڑی تاکید کی ہے، متعدد آیات میں اس کا حکم آیا ہے، اور ان تمام چیزوں سے بچنے کی تاکید فرمائی گئی ہے جن کی بنیاد پر یہ رشتہ کمزور ہوتا ہے یا ٹوٹتا ہے، لیکن ان سب کے باوجود اگر میاں بیوی میں نباہ کی صورت

نہیں ہو، دونوں کا ساتھ رہنا مشکل ہو جائے، شوہر اپنی بیوی کی اصلاح سے عاجز ہو یا بیوی اپنے شوہر کو سمجھانے سے قاصر ہو جائے، ایسی صورت میں شریعت نے میاں بیوی کو تاریکی میں بھٹکنے کے لئے نہیں چھوڑا ہے بلکہ ان کی رہنمائی کی ہے، اور دونوں کے مسائل کا حل پیش کیا ہے، اسی حل کا نام طلاق ہے، گویا طلاق کی مشروعیت میاں بیوی کے درمیان اس منافرت کو ختم کرنے کے لئے ہے، جس کا دوسرا کوئی حل نہیں ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اسلام میں طلاق کوئی پسندیدہ بات ہو، بلکہ یہ انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی مشروعیت رشتہ ازدواج کے لئے بطور علاج کے ہے، میاں بیوی کے درمیان پیش آنے والے ناقابل حل مسائل کا خاتمہ اسی کے ذریعہ ممکن ہے، اگر طلاق نہ ہو تو میاں بیوی کے درمیان کی منافرت سے نہ صرف دونوں کی زندگی جہنم بنے گی بلکہ پورا خاندان اس آگ میں جلے گا۔

طلاق ایک معتدل حل ہے، اس طور پر اگر کسی وجہ سے شوہر کو بیوی پسند نہیں ہے یا اس کے ساتھ نباہ مشکل ہے، ایسی صورت میں اگر طلاق کا راستہ نہ ہو تو پھر مرد ایسی عورت پر ظلم کے پہاڑ توڑے گا، اور اسے اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے شرعی حدود سے آگے بڑھ جائے گا، اس لئے نکاح کے رشتہ کو ختم کرنے کے لئے کوئی راستہ ضروری ہے، اور اسی راستہ کا نام طلاق ہے۔

طلاق کا حکم

طلاق دینے کی مختلف صورتیں ہیں، ہر صورت میں طلاق دینا گناہ نہیں ہے، بلکہ بعض صورتوں میں طلاق دینا ہی واجب ہو جاتا ہے، فقہاء نے حکم کے اعتبار سے طلاق کی پانچ قسمیں کی ہیں: واجب، مستحب، مباح، حرام، مکروہ، فقہ کی اکثر کتابوں میں اس کا ذکر ہے:

۱۔ واجب: جب بیوی کے حقوق کی ادائیگی ممکن نہ ہو، مثلاً شوہر نامرد ہو، بیوی فاحشہ ہو، اسی طرح جب دونوں حکم مصالحت کی کوشش میں طلاق کو ہی بہتر حل قرار دیں، ان صورتوں میں طلاق دینا واجب ہو جاتا ہے۔

۲۔ مستحب: جب بیوی احکام خداوندی کی تعمیل میں کوتاہی کرے، مثلاً نماز چھوڑتی

ہو، یا عورت کی زبان یا عمل سے مرد کو تکلیف پہونچتی ہو، یا آپسی نزاع کی وجہ سے عورت طلاق کا مطالبہ کرے، ان صورتوں میں طلاق دینا مستحب ہے۔

۳۔ مباح: جب طلاق دینے کی ضرورت ہو مثلاً عورت بداخلاق ہو، شوہر کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرتی ہو، شوہر سے محبت نہیں کرتی ہو، ان صورتوں میں طلاق دینا مباح ہے۔

۴۔ حرام: طلاق دینے کے بعد عورت کے گناہ میں ملوث ہونے کا یقین ہو، یا وہ دوسرا نکاح نہ کرسکتی ہو، اسی طرح شریعت میں بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف طریقہ سے طلاق دینا، مثلاً ناپاکی کے ایام میں طلاق دینا، ایک ساتھ تین طلاق دینا، ان صورتوں میں طلاق دینا حرام ہے، طلاق تو واقع ہو جائے گی، البتہ شوہر گنہ گار رہوگا۔

۵۔ مکروہ: بلا ضرورت طلاق دینا جس سے عورت کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو۔
(الموسوعۃ الفقہیۃ، ج۹، ص: ۲۹)

طلاق اصلا مباح ہے یا مکروہ؟

فقہاء کے مابین اس بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ طلاق دینا اصلا مباح ہے یا مکروہ، فقہاء احناف میں امام سرخسی اور علامہ حصکفی کی رائے یہ ہے کہ یہ مباح ہے، جبکہ علامہ کاسانی، علامہ ابن ہمام اور فتاوی ہندیہ میں مذکور رائے یہ ہے کہ طلاق دینا اصلا مکروہ ہے، ضرورتا جائز ہے۔ (الفتاوی الہندیہ، ج۱، ص: ۳۴۸)

طلاق دینے کا طریقہ

شریعت نے جب طلاق کو مشروع کیا ہے تو اس کا طریقہ بھی متعین کیا ہے تاکہ طلاق عورت کے لئے باعث رحمت ہو، باعث زحمت نہیں، اس لئے شریعت کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق طلاق کو طلاق سنت اور اس کے برعکس طلاق کو طلاق بدعت کہا جاتا ہے، اس اعتبار سے طلاق کی درج ذیل تین قسمیں ہیں:

طلاق احسن: طلاق دینے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو ایک طلاق رجعی دے، ایسی پاکی کی حالت میں جس میں اس سے تعلق قائم نہ کیا ہو۔

طلاق حسن: ہرمہینہ میں پاکی کی حالت میں ایک طلاق رجعی دے، اسی طرح تین مہینوں تک کرے۔

اس طرح سنت کے مطابق طلاق دینے کے تین شرائط ہیں:

ا۔معقول ضرورت کی بنیاد پرطلاق دے۔

۲۔ایسی پاکی کی مدت میں طلاق دے جب تعلق قائم نہ کیا ہو۔

۳۔الگ الگ طلاق دے، ایک ساتھ طلاق نہ دے۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ، ص: ۶۹۲۰)

طلاق بدعت: ان دوطریقوں کے علاوہ طلاق کی تمام شکلوں کوطلاق بدعت کہتے ہیں، مثلاً ناپاکی (حیض یانفاس) کی مدت میں طلاق دینا، پاکی کی حالت میں طلاق دینا جب بیوی سے تعلق قائم کرچکا ہو، ایک ساتھ دو یاتین طلاق دینا، ایک ہی پاکی کی مدت دو یاتین طلاق دینا، ان صورتوں میں طلاق تو واقع ہوجاتی ہے، البتہ طلاق دینے والا گنہ گار ہوتا ہے۔

حضرت عمر کے صاحب زادے عبداللہ بن عمر نے اپنی اہلیہ کوناپاکی کی حالت میں طلاق دی تھی یہ خبرسن کررسول اللہ ﷺ بہت غصہ ہوئے (صحیح البخاری) کیونکہ ناپاکی کے زمانہ میں طلاق دینے کی وجہ سے عورت کی عدت لمبی ہوجاتی ہے۔

محمود بن لبید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کواطلاع ملی کہ کسی شخص نے اپنی بیوی کوتین طلاقیں دی تھیں تو آپ ﷺ غصہ سے کھڑے ہوگئے اورفرمایا ’’أ یلعب بکتاب اللہ عزوجل و أنا بین أظھرکم‘‘ (کیا کتاب اللہ کے کھلواڑ کیا جائے گا حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں) آپ کے غصہ کودیکھ کرایک صحابی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول کیا میں اس کی گردن نہ اڑادوں۔ (سنن النسائی، حدیث نمبر: ۳۴۱۴)

تین طلاق کاحکم

تین طلاق اگرتین ایسے پاکی کے ایام میں دیا جب تعلق قائم نہ کیا ہو، تو یہ طلاق

حسن ہے، جمہور ائمہ کے نزدیک اس سے تین طلاق واقع ہوتی ہے۔

تین طلاق کی ایک شکل یہ ہے کہ کوئی ایک ہی ساتھ تین طلاق دے یا ایک ہی طہر میں تین طلاق دے، ایسی صورت کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے:

ا۔اکثر صحابہ، خلفاء راشدین اورائمہ اربعہ کے نزدیک اس سے تین واقع ہوتی ہے۔

۲۔علامہ ابن تیمیہؒ، ان کے شاگرعلامہ ابن قیمؒ، اسحٰق بن راہویہؒ اورشیعوں کے فرقہ زیدیہ کے نزدیک ایک طلاق واقع ہوگی۔

۳۔شیعوں کے فرقہ امامیہ کے نزدیک ایسی صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ص: ۶۹۲۸)

طلاق کے طریقہ سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں الگ الگ پاکی کی مدت میں طلاق دینے کا حکم ہے، نیز یہ بھی شرط ہے کہ جس پاکی کی مدت میں تعلق نہ قائم کیا ہو، تاکہ مرد میں رجوع کرنے کی چاہت باقی رہے، اور ہر مرحلہ میں سوچنے اورغوروفکر کرنے کا موقع ملے، اسی طرح عورت کے لئے بھی اپنی اصلاح کرنے کی مہلت ہو، اگرعورت کی اصلاح ہوجاتی ہے تو پھر مزید طلاق کی ضرورت باقی نہیں رہے گی، اور ایک طلاق کے بعد بھی اصلاح نہ ہو تو دوسرے مہینہ دوسری طلاق دینے کی گنجائش ہوگی۔

عدت کانفقہ

طلاق کے بعد عدت گزارنا واجب ہے، حمل نہ ہونے کی صورت میں عدت تین ماہ اورحمل کی صورت میں بچہ کی پیدائش تک عدت ہے، اس پوری مدت کا نفقہ شوہر پرواجب ہے، ارشاد ہے: وان کن اولات حمل فانفقوا علیھن حتی یضعن حملھن (سورہ طلاق: ۶)

ترجمہ: اگر وہ مطلقہ عورتیں حمل والیاں ہوں توحمل پیدا ہونے تک ان کا خرچ دو۔

عدت کے بعدعورت کانفقہ

عدت کے بعد جب عورت نکاح سے آزاد ہوجائے تو سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ

کسی مرد سے نکاح کرلے، شریعت میں دوسری شادی کی بڑی تاکید آئی ہے، ہمارے معاشرہ میں اس کا رواج بہت کم ہے، اگر ایسی عورت کی دوسری شادی ہوجائے تو اس کی پوری ذمہ داری دوسرے شوہر پر عائد ہوگی۔

دوسری شادی نہ ہونے کی صورت میں لڑکی کے والدین، اولاد، بھائی، چچا اور اس طرح دوسرے رشتہ داروں پر اس کا نفقہ واجب ہے، اور یہ شرعا لازم ہے، اگر کسی عورت کے یہ نسبی رشتہ دار نہ ہوں تو اصلاتو اصلا یہ حکوت وقت کی ذمہ داری ہے کہ ایسی عورتوں کی کفالت سرکاری خزانہ سے کی جائے، لیکن ہندوستان میں فی الحال بظاہر یہ مشکل ہے اس لئے مسلم سماج کی ذمہ داری ہے کہ ایسی عورتوں کی کفالت کا انتظام کرے۔

نبوی تعلیم کی خوشبو

اسامہ بن مولانا امتیاز ندوی (معہد سیدنا ابی بکر صدیق)

یہ دنیا بھول بھلیاں کی طرح ہے، جو اس میں بھٹک گیا، مصیبت میں پڑ گیا، ہلاکت اس کا مقدر ہوگیا، اس بھول بھلیاں سے نکلنے کا واحد راستہ ہے اور وہ ہے نبوی تعلیم، یہ تعلیم تاریک رات میں روشن ستاروں کی مانند ہے، اعلی اخلاق کی ہی تعلیم وہ تعلیم ہے جو کامیاب زندگی کی تشکیل کرتی ہے، ضلالت کی تاریکیوں سے نکال کر سیدھی راہ کی طرف رہبری کرتی ہے، انسان کو صحیح زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتی ہے، خوش اخلاقی اور تواضع انکساری ،فرمابرداری اور حلم وبردباری، امانت داری اور وفاشعاری، مروت اور انسانیت سکھاتی ہے، گھریلو زندگی اور آپ کے معاملات میں ضابطہ اخلاق متعین کرتی ہے، نبوت کی اخلاقی تعلیمات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوجائے گی کہ اس میں وہ تمام چیزیں ہیں جن سے دین ودنیا کی جامعیت کا پورا ثبوت ملتا ہے، اس لئے کہ حضرت محمد ﷺ ساری زندگی مکارم اخلاق کی دعوت دیتے رہے، خادم رسول حضرت انس بن مالک جو آپ کی خدمت میں دس سال رہے، فرماتے ہیں کہ اس طویل وقفہ میں آپ نے کبھی اف تک نہ کہا، یہ تھی نبوی تعلیم جس کی خوشبو سے دنیا معطر ہوگئی۔

یہ عبرت کی جا ہے، تماشا نہیں ہے

مولانا محمد فرمان ندوی

(استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

یہ عالم رنگ وبو دنیا کے نام سے متعارف ہے، اللہ رب العزت نے اس کو میدان عمل بنایا ہے، اس میں انسان کو خیر وشر کا اختیا دیا گیا ہے، مزید برآں اس کو قوت تمیز بھی عطا گئی ہے، تا کہ وہ آخرت کے لئے ذخیرہ چھوڑ سکے، جو کہ آخری منزل اور جائے مراد ہے، دنیا کے معنی قریب ترین شئی کے ہیں، آخرت کی بنسبت یہ انسان کے ساتھ ہے، اس لئے اس کو دنیا کہا گیا ہے، قرآن میں دنیا کا لفظ ۱۱۵/مرتبہ آیا ہے، قرآن کا عددی اعجاز ہے کہ آخر ت کا ذکر بھی ۱۱۵/ بار آیا ہے، دنیا کا تعارف قرآن میں اس طرح آیا ہے: دھوکہ کا سودا، لہو ولعب کی جگہ، امتحان کی جگہ، مصائب کا گھر، مسافرت کی منزل ،عبادت وعمل کا مقام وغیرہ۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دنیوی زندگی کے دو پہلو ہیں: مثبت اور منفی، مثبت کے سلسلہ میں قرآن گیا ہے: ولاتنس نصیبك من الدنیا یعنی دنیا کے اندر اپنے حصے کو فراموش نہ کرو، اور ارشاد باری ہے: ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة ، وقنا عذاب النار۔ اے اللہ! دنیوی زندگی میں ہمیں بہتری عطا فرما، اور اخروی میں بھی، اور جہنم کے آگ سے ہم کو محفوظ فرما۔ دنیا کی بہتری کا مطلب یہی ہے کہ انسان کو اللہ کی مرضیات کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق مل جائے۔

منفی پہلو یہ ہے کہ یہ دھوکہ کا سودا ہے، چنانچہ انسان اس کے اندر مسافرانہ زندگی گذارے اور اس کو قید خانہ سمجھے، کیونکہ ارشاد باری ہے: دنیا کی زندگی لہو ولعب، زیب وزینت اور فخر ومباہات سے عبارت ہے، انسان اپنے بچپن میں کھیل کود میں مگن رہتا ہے، اس کی جوانی

تراش وخراش میں گذرتی ہے،اور بڑھاپے میں اس کے اندر فخر کے جذبات امنڈتے ہیں پھر دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے۔ یہ دنیا کی اصل حقیقت ہے،ایک حدیث میں دنیا کی تشبیہ ایک کالی کلوٹی، بدصورت عورت سے آئی ہے کہ جس طرح وہ عورت انسان کی نگاہ میں خوش منظر نہیں ہوتی ہے اسی طرح دنیا کی محبت اس کے اندرون میں جاگزیں نہیں ہونا چاہئے۔

دنیا کی بے ثباتی کا اندازہ اس تمثیل سے بخوبی ہوتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

ان کے سامنے دنیا کی مثال بیان کرو، جیسے پانی ، جسے ہم آسمان سے اتارتے ہیں ،اس سے زمین کا سبزہ ملا جلا نکلا ہے، پھر وہ آخر کار چورا چورا ہوجاتا ہے، جسے ہوائیں اڑائے لئے پھرتی ہیں، اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے ۔ یہ مثال سورۂ یونس (۲۵) سورۂ زمر (۲۱) ،اورسورۂ حدید(۵۰) وغیرہ میں بھی وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا: میری مثال دنیا کے اندر اس سوار کی سی ہے جو کسی سایہ میں تھوڑی دیر دم لے اور چلتا بنے، کسی اللہ والے نے کہا ہے:

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے، تماشہ نہیں ہے

آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی چندروزہ ہے، سورۂ نساء (۷۷) میں فرمایا گیا: دنیا کا سودا بہت معمولی ہے، اور آخرت ہی متقیوں کے لئے بہترین سوغات ہے، لیکن مقام افسوس ہے کہ لوگ اس کھوٹی پونجی کے حصول کے لئے سرگرداں نظر آتے ہیں، چنانچہ سورۂ بقرہ (۲۰۱) میں فرمایا گیا ہے: کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب !دنیا کی زندگی میں ہم کو خیر کثیر عنایت فرما، ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں کچھ بھی نہیں ہے ،اور کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے میرے پرروردگار! دنیا کی زندگی میں بھی ہم کو نعمتوں سے سرفراز فرما اور آخرت میں بھی، اور جہنم کی آگ سے محفوظ فرما، ایسے ہی لوگوں کے لئے آخرت میں انعام ہے یعنی انکے اعمال کا حصہ ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

دنیا دار مادہ پرست ہوتا ہے، اس کو صرف اپنے پیٹ کی فکر دامن گیر رہتی ہے،

اس کا اعلان ہوتا ہے کہ روٹی ، کپڑا، مکان ہی ہمارا سرمایۂ حیات ہے، وہ ناؤنوش کا پجاری ہوتا ہے، چنانچہ وہ دنیا کے پیچھے چلتا ہے، اور دنیا اس سے دور رہتی ہے، جبکہ خداپرست انسان وحدانیت کا قائل ہوتا ہے، اس کا اندرون ذکر الٰہی سے روشن ہوتا ہے، وہ معدہ کا غلام نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا بندہ اور اس کے حکم کے سامنے سرافگندہ ہوتا ہے، ایسے ہی کے قدموں میں دنیا آکر اپنی پیشانی رگڑتی ہے اور ذلیل وخوار ہوتی ہے۔

انہی دونظریات کے حاملین کا تذکرہ سورۂ کہف کی آیت ۳۲ تا ۳۹ میں آیا ہے:

دو باغ والے تھے، دونوں بڑے خوش نصیب تھے، اللہ نے ان کو کھجور اور انگور کے باغات کے علاوہ قابل کاشت زمین بھی ان کو دی تھی ، ایک مرتبہ اپنے دوست (جو خداشناس تھا) سے مارے فخر کے کہتا ہے کہ دیکھو میں تم سے زیادہ مالدار ہوں ، پھر وہ اپنے باغ میں دولت کے نشہ میں چور ہوکر داخل ہوا، ااور ڈینگیں مارنے لگا، اس کو اس کے دوست نے سمجھایا لیکن اس نے اسکی کچھ بھی نہ سنی۔ جب کہ اس کے دوست نے اللہ کی دی ہوئی نعمت پر تشکر کے کلمات کہے ۔ یہ مثال ہے ایک خداپرست اور مادہ پرست انسان کی۔ خلیفۂ رابع حضرت علی رضی اللہ عنہ دنیا کی حقیقت سے واقف تھے، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ اے دنیا ! کیا تو میرے پیچھے پڑی ہے، چل ہٹ ، کسی اور کو دھوکہ دینا ، مجھے معلوم ہے کہ تیری عمر بہت مختصر ہے۔ اور تیرے مسائل بیشمار ہیں۔☆☆☆☆

بقیہ: نماز کے چند اہم مسائل...... مسبوق کے لئے سلام: مسبوق کو امام کے ساتھ سلام نہیں پھیرنا چاہئے، اس کے بغیر ہی اپنی بقیہ نماز پوری کرنی چاہئے، اگر مسبوق سلام پھیر دیتا ہے اس کی کئی شکلیں ہوں گی، مثلاً ایک شکل یہ ہے کہ امام کے سلام پھیرنے سے قبل یا امام کے بالکل ساتھ ساتھ سہواً سلام پھیرا ہو تو ایسی صورت میں نماز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا ۔ دوسری شکل یہ ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد سلام پھیرا ہے تو مسبوق کیلئے ضروری ہے کہ اخیر میں سجدہ کر کے اپنی نماز مکمل کرے، البتہ دونوں صورتوں میں عمل عمداً ہوا ہے تو نماز فاسد ہوجائے گی، اور نئے سرے سے نماز ادا کرنی ہوگی۔ (ردالمحتار، ج۲،ص:۳۰۱)

نماز سے متعلق چند اہم مسائل

مولانا اکرام احمد ندوی

(استاذ المعہد العالی للدراسات الاسلامیۃ، لکھنؤ)

عصر اور فجر نمازوں کے بعد نوافل کاحکم

احادیث میں اسکی صراحت ہے کہ فجر اور عصر نماز کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھنی چاہئے، اسی بنیاد پر فقہاء نے یہ مسئلہ ذکر کیا ہے کہ ان دونوں وقتوں میں سنن ونوافل پڑھنا ممنوع ہے، لیکن قضاء نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ بلا کراہت صحیح ہوگی۔

(فتاویٰ قاضی خان، کتاب الصلاۃ، ج۱،ص۴۹)

رکوع میں جاتے ہوئے تکبیر تحریمہ کہنا

قیام کی حالت میں مکمل تکبیر تحریمہ کہنا شرط ہے، بسا اوقات لوگ امام کو رکوع کی حالت میں دیکھتے ہیں تو رکعت پانے کیلئے تکبیر اس طرح کہتے ہیں کہ اس کا بعض حصہ قیام کی حالت میں اور بعض رکوع کی حالت میں ادا ہوتا ہے، ایسا شخص نماز میں شامل ہونے والا نہیں سمجھا جائے گا، اور اس کی نماز درست نہیں ہوگی۔ (فتاویٰ قاضی خان، ج۱،ص ۵۶)

تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ چھوڑے بغیر ہاتھ باندھنا چاہئے

کچھ لوگ تکبیر تحریمہ کے بعد دونوں ہاتھوں کو پہلے گراتے ہیں پھر باندھتے ہیں، یہ طریقہ مناسب نہیں ہے، تکبیر تحریمہ کے فوراً بعد ہاتھ باندھ لینا چاہئے، کتب فقہ میں اس کو بہتر طریقہ قرار دیا گیا ہے۔ (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الصلاۃ، ج۱،ص:۱۸۸)

رکوع اور سجدہ پورے اطمینان سے کرناچاہیے

فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہونا

چاہئے، پھر سجدہ کیلئے جانا چاہئے، اس طرح ایک سجدہ مکمل کرنے کے بعد اطمینان کے ساتھ بیٹھنے کے بعد دوسرا سجدہ کرنا چاہئے، عموماً لوگ دونوں صورتوں میں اطمینان کے ساتھ عمل نہیں کرتے بلکہ بہت عجلت کے ساتھ اس عمل کو ادا کرتے ہیں، اس طرح کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔

(مراقی الفلاح مع حاشیہ الطحطاوی، کتاب الصلاۃ،ص۲۴۹)

مقتدی کے لئے قعدہ اولی میں التحیات مکمل کرنے کاحکم

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قعدہ اولی میں مقتدی کے تشہد کی تکمیل سے قبل ہی امام صاحب تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں، ایسے وقت میں مقتدی کیا کرے؟ اس بارے میں فقہاء نے وضاحت کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ اگر امام کے ساتھ قیام چھوٹنے کا اندیشہ نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ وہ پہلے تشہد کو مکمل کرے پھر امام کی اتباع کرے۔

(الفتاویٰ الہندیہ، ج۱،ص:۱۴۷)

قعدہ اولی چھوٹنے کی صورت میں کیاکریں

چار رکعات یا تین رکعات والی نماز میں دو رکعت کے بعد تشہد کے بقدر بیٹھنے کو قعدہ اولی کہتے ہیں، اگر کسی سے سہواً قعدہ اولی فوت ہوجائے تو اس کی دو صورتیں ہوں گی، ایک یہ کہ اگر قعدہ اولی فوت ہونے کے بعد جب مکمل کھڑا ہوگیا اور احساس ہوا کہ قعدہ اولی فوت ہوگیا ہے تو ایسے وقت میں تشہد کیلئے نہ بیٹھے بلکہ اسی حالت میں نماز مکمل کرلے، اخیر میں صرف سجدہ سہو کرلے نماز درست ہوجائے گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ قعدہ اولی فوت ہوگیا لیکن وہ سیدھا کھڑا نہیں ہو پایا تھا بلکہ بیٹھنے کے ہی قریب تھا تو ایسی صورت میں بیٹھ کر تشہد مکمل کرے اور اخیر میں سجدہ سہو کرکے اپنی نماز مکمل کرے۔ (رد المحتار، کتاب الصلاۃ، ج۲،ص:۵۴۹)

باقی ص ۴۶ پر